عروس مشرق

تصنیف

حضرت علامہ راشد الخیری

عصمت بک ڈپو

ایک مفید اصلاحی کتاب

شرق

(علامہ) راشد الخیری مرحوم

قیمت

روپیہ

یونائیٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ

فہرست مضامین عروس مشرق
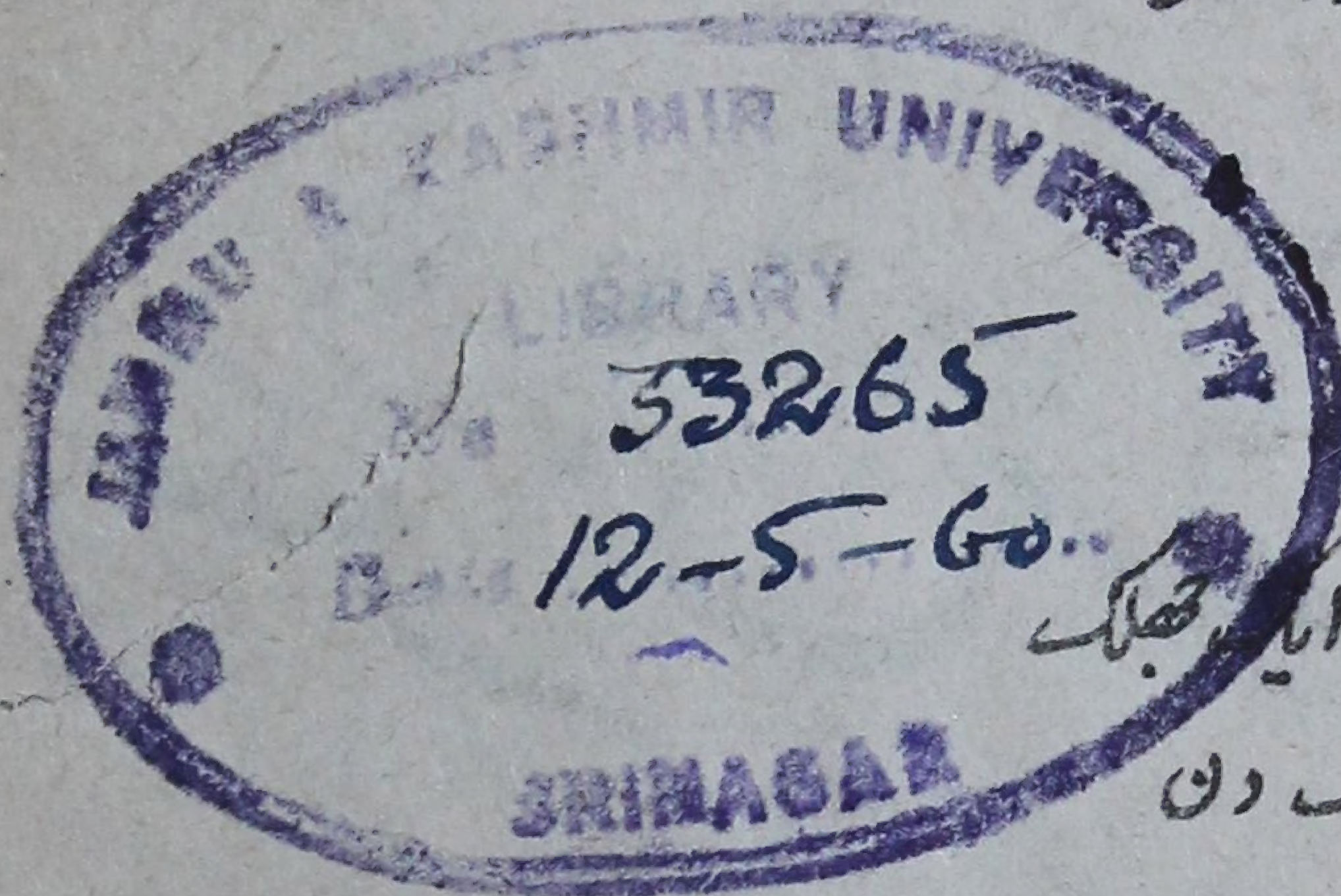
روس مشرق

اس نازک دور میں جب مغربی طوفان چمنستان مشرق کو پامال کر رہا ہے اور
یورپ کی اندھا دھند تقلید ان خوبیوں کو مٹا رہی ہے جو ہندوستان کے لئے مایہ ناز تھیں
حضرت علامہ راشد الخیری کے لٹریچر نے قوم بدبخت کی آنکھیں کھول دیں اور یہ احساس
پیدا کر دیا کہ دور کے ڈھول سہاونے، جس رسیلی آواز پر ہندوستانی لٹو ہو رہے ہیں وہ اس قدر
سخت اور کرخت ہے کہ کانوں کے پردے پھاڑ دے گی۔ اپنے بیش بہا جواہرات گنوا کر جو چمکتے
ہوئے ہیرے سمجھے جا رہے ہیں وہ شیشے کے ٹکڑے اور جنہیں سونا خیال کیا جا رہا ہے وہ
چمکیلے پیتل سے زیادہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ گذشتہ چوتھائی صدی میں اگر حضرت علامہ
راشد الخیری مغربی سیلاب کو روکنے کی ان تھک مسلسل کوششیں نہ فرماتے
تو آج نہ جانے تعلیم یافتہ مسلمان لڑکیوں کا کیا حشر ہوتا۔ "جوہر قدامت" "سراب مغرب"
"بنت الوقت" "سفوتی" جیسی مشہور تصانیف اسی موضوع پر ہیں انکے علاوہ
متعدد مضامین عصمت۔ بنات۔ تمدن وغیرہ میں شائع ہوئے تھے جن میں سے بعض
مضامین تو گزشتہ مجموعوں میں آ چکے ہیں اور ۱۸ مضمونوں کا مجموعہ یہ شائع کیا جا رہا ہے
اصلاح رسوم پر اور جہالت کے خلاف مصور غم سے زیادہ کسی نے نہیں لکھا لیکن اس صدی
کے مصلح اعظم نے خذ ما صفا دع ما کدر پر ہمیشہ زور دیا اور بار بار تحریر فرمایا کہ مغرب کی
اچھی چیزیں ضرور لو مگر اپنی خوبیوں کو فنا نہ کرو۔ عروس مشرق میں مشرقی معاشرت اور تہذیب
کے بعض زریں اصولوں کو نمایاں کیا گیا ہے جنہیں ہم نے پس پشت ڈال رکھا ہے لیکن جنہیں قائم
رکھنے سے ہی مشرق کے بسنے والے کامیابی کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔

۲۶ راگست سنہ ۱۹۳۶ء

رازق الخیری

اگلی برساتوں کی ایک جھلک

جب ہم ترقی کی موجودہ رفتار پر نظر ڈال کر دیکھتے ہیں کہ وقت رہروان فانی کے نقش قدم تک مٹائے چلا جا رہا ہے۔ اور آج شجر زندگی کی ہر شاخ تہذیب ہو یا تمدن اپنی حالت میں خوش اور کیفیت میں مگن ہے۔ تو اس دور آخر کی یاد جس کی اب جھلک کو بھی آنکھیں ترستی ہیں کلیجے کے ٹکڑے اڑا دیتی ہے۔ وہی زمین و آسمان ہے۔ وہی ہندو اور مسلمان، وہی صبح اور شام ہے۔ وہی دن اور راتیں مگر وہ معاملے اور باتیں جو جری ہوئیں، ختم ہوئیں اور ملیامیٹ ہوگئیں۔ ترقی کا خبط تسمہ پا کی طرح زندگی کی ہر کیفیت میں چمٹا ہوا ہے۔ حد یہ ہے کہ فرحت کا خندہ اور الم کا نالہ بھی ترقی سے وابستہ ہے۔ یہ تغیر بجائے خود قابل استعجاب نہیں لائق حیرت وہ ملک وہ وطن اور وہ لوگ ہیں جو نشہ تقلید میں مست ہو کر اتنے بیخود ہو جائیں کہ وطن کی تضحیک پر اغیار کے ہم آہنگ ہوں۔ آبائی جوہر ان کو بار ہوں۔ اور مایۂ ناز خزائن کو ننگ خیال کریں۔

ترقی کی حد آخر خلقت ہی پر ختم نہیں ہوتی۔ قدرت بھی یوماً فیوماً اور لمحہ بلمحہ ترقی کر رہی ہے ہندوستانی عروس فلک جو برسات میں پندرہ پندرہ دن جھڑیاں لگاتی تھی ایسی مہذب بنی کہ کبھی بہت مہربان ہوئی تو ایک دو روز دہ بھی مارے باندھے اور بہ جبر و اکراہ لب نازک پر مسی لگائی۔ ورنہ ساون بھادوں کا مہینہ دھویا دھایا دیدہ صاف پیداوار کی ترقی اس درجہ کو پہنچی کہ وہ اناج جس کو کوئی ٹکے سیر بھی نہ پوچھتا تھا، چھاج اور چھلنیاں چھوڑ فینسی مشینوں میں باوا دادا کے موتوں کی صورت دکھا رہا ہے۔

ترقی کی ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے آسمان و زمین کو مبارک، ملک و وطن
کو نصیب، مگر ہم تو اسی قدامت کے عاشق اور جہالت کے شیدا ہیں۔ جس کو
ترقی کی رو فنا کر گئی۔ اور اب جس کی صورت دوبارہ نظر آنی مشکل اور محال۔
آج خواتین کا تہذیب یافتہ گروہ برسات میں سفید لباس پہنے ڈاسن کا
بوٹ اڑائے پارک کی روشوں پہ چھتریاں ہاتھ میں لئے ٹہلتا نظر آتا ہے۔ اور
بنگلوں اور کوٹھیوں پہ احتیاط کرتا ہے کہ ہوا خراب نہ ہونے پائے جہالت اپنے
دور میں خواتین سے برسات کا استقبال کس طرح کرواتی تھی۔ اس کی ایک دھندلی
سی تصویر یہ موجود ہے۔
آسمان پہ کالی کالی گھٹائیں نمودار ہو گئیں۔ بادل امنڈ امنڈ کر گھر آئے۔ جیٹھ
اور بیساکھ کی تپی ہوئی آنکھوں میں پانی بھرے۔ ہوا کے جھونکوں سے جان میں جان
آگئی۔ کوئل کی آواز دور سے کانوں میں آرہی ہے پپیہا ایک طرف بیٹھا بول رہا ہے۔
اور یہ تمام کیفیات اس لئے کہ قیامت خیز گرمی نے جان پہ بنا دی تھی طبیعت پر خاص
اثر پیدا کر رہی ہیں جھوٹی ترقی نے جو گل کھلائے وہ پوشیدہ نہیں۔ جہالت اس ضرورت کو
محسوس کر رہی تھی۔ جس کو اعلیٰ تعلیم نے نظر انداز کر کے ملک کو تہذیب کی آڑ میں ناقابل
تلافی نقصان پہنچا دیا۔ اور جس خاک سے عصمت کی کامل دیویاں اٹھیں وہاں بنگال
کے مشہور جلسہ میں جیسی عورتیں ناچنے لگیں۔
ہندوستانیوں کا عقیدہ ہمیشہ یہ رہا کہ پھاگن کے مہینہ میں مرد کے اور ساون
بھادوں میں عورت کے خیالات موسم کی مناسبت سے یاد محبوب کی طرف خصوصیت
سے متوجہ ہوتے ہیں اور حالات ان کے جذبات کو اس قدر منتشر کر دیتے ہیں کہ وہ
اس کے سوا سب کچھ بھول جاتے ہیں۔
ادب کی جو تفریق آج وقت نے کر دکھا ہے اس وقت نہ تھی ہندی اردو کا جھگڑا

تو اب بیس برس سے کانوں میں پڑنا شروع ہوا ہے۔ اسوقت اردو آہستہ آہستہ ترقی کر رہی تھی۔ اور گو بہت کچھ کر چکی تھی۔ مگر مسلمانوں کا تمدن ہندی جذبات سے بغلگیر ہونے میں تعصب سے ہزاروں کوس دور تھا اور ہندی گیت دوہے ٹھمریاں مسلمانوں میں رل مِل کر اس طرح شیر و شکر ہوئی تھیں کہ آج سے پچاس برس پہلے کی شاید ہی کوئی مسلمان عورت ایسی ہو جسے ہندی کا کوئی گیت نہ آتا ہو۔ اُردو جس وقت تک اتنی صاف نہ ہوئی تھی اس وقت تک خود اُردو اہل قلم کی زبان وہی تھی جو اب ٹھیٹ ہندی سمجھی جا سکتی ہے مثلاً امیر خسرو بنولی کی پہیلی فرماتے ہیں

تمدر سے ایک تریا اتری اسنے بہت رجھایا　　باپ کا اس کے نام جو پوچھا آدھا نام بتایا

آدھا نام پتا پر پیارا بوجھ پہیلی موری　　امیر خسرو یوں کہیں اپنے نام بنولی

سگری رین مورے سنگ جاگا　　بھور بھئی تب بچھڑن لاگا

اس کے بچھڑے پھٹات ہیا　　اے سکھی ساجن نا سکھی دیا

ہم کو اس وقت زبان سے مفصل بحث کرنی مقصود نہیں ہے کہنا یہ ہے کہ تمدن جاہلیت اپنی اشد ضرورتوں کو کس طرح پورا کر رہا تھا۔ ہولی کے موقعہ پر مرد گاتے تھے اور ہولی اکثر کی زبان سے ادا ہوتی تھی۔

ہولی آج جلو چاہے کال　　مورا کنور کنہیا سو بیہ آن ملو ری

ہولی آج جلو چاہے کال

یہ معمولی باتیں مٹنے والی تمدن ہی کی رہبر نہیں، بلکہ یہ بتا رہی ہیں کہ اس زندگی کا عین مقصد کیا تھا۔ جو چیز اس وقت تو کیر کٹر کہی جاتی ہے اسکی اصلاح گرد و پیش کے حالات سے اعمال سے غرض ہر طرح سے کی جاتی تھی۔ اور اگر حسینہ ترقی معاف کرے تو کہوں گا کہ جہالت کا دیو جیب باعتبار کیر کٹر اب سے زیادہ خوشنما تھا۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا برسات کے کالے اودے بادل گھنگھور گھٹائیں، کوئل

اور بیاہیا عورت کی حالت میں زمین آسمان کا فرق پیدا کر دیتے تھے دلی میں بھی اور دوسرے مقامات پر بھی دستور تھا۔ اگرچہ اب برائے نام رہ گیا کہ برسات میں عورتوں کے واسطے جھم گرتے تھے جس کا کھلا ہوا منشاء تو یہ تھا کہ گرمی اور حبس میں لڑکیاں جو جوانی کی وجہ سے گرمی کی پروا کرتی ہیں نہ سردی کی۔ اندر دالان میں گھٹی بیٹھی نہ رہیں۔ ذرا باہر نکل کر صحن میں بھی آئیں اور جھولا قدرتی پنکھا بن کر ان کو ہوا پہنچائے اب ذرا اسوقت کی باتوں پر نظر ڈالو۔ محبت کی گھٹائیں جھوم جھوم کر امنڈ رہی ہیں بہنوں کی چھوٹی ہوئی لڑکیاں جن کی آنکھیں میکے کے کاجل کو سسرال میں تڑپ گئی تھیں اسی بہانے باپ بھائی کے گھر جمع ہوتی ہیں۔ جھم گر رہے ہیں۔ ہنڈولے پڑے ہیں۔ کواریاں اور بیاہیاں برابر کی سہیلیاں ساون کے طفیل مدتوں بعد مل جل کر رنگ رلیاں منا رہی ہیں بظاہر میں سوت اور ریشم مونجھ اور بان کی رسیاں ہوں اور ڈوریاں ہوں۔ مگر درحقیقت خلوص وصداقت کے وہ پھندے ہیں جو مدت العمر گلوگیر رہیں گے۔ اور اس پر لطف منظر کو تا دم واپسیں فراموش نہ ہونے دیں گے۔

جھولے کے ایک رقعہ کا آخری شعر یاد آگیا اور دل تڑپ گیا اللہ اللہ کیا چیزیں غارت ہو گئیں۔ لڑکی کا جھولا ہے بلاوے پھر رہے ہیں۔ شرکت کے واسطے منتیں خوشامدیں ہو رہی ہیں۔ رقعہ منظوم ہے برسات کا سماں کھینچا گیا ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے غالباً منشی ذکاء اللہ مرحوم کی پوتی کا جھولا تھا اور آخری شعر یہ تھا۔

بلاوا ہے جھولے کا مت بھولنا   جھلانا ہمیں اور خود جھولنا

جہالت سے تعبیر کرو یا حماقت سے۔ مگر ہم تو یہی کہیں گے کہ چمنستان مشرق کی بہار وداع ہو چکی ہے دنیا اس ترقی پر نازاں ہو اور ہم اپنا منہ پیٹ کر کہیں کہ بھرے میلے بچھڑ گئے لہلہاتے پودے اجڑ گئے اور بنے کھیل بگڑ گئے۔

میرے عزیزو ہنسنے سے پہلے بات سن لو۔ ہنسو، خدا تم کو ہنستا رکھے مگر اس

جہالت کا بھی چھوٹا سا منظر دیکھ لو۔

کڑاہیاں چڑھی ہوئی ہیں اور آج بہتر سے بہتر دوائیں اور چیزیں جو طبیب اور ڈاکٹر ہیضہ کے دنوں میں استعمال کرواتے ہیں ان کی احتیاط پہلے ہی کرلی گئی اور پکوان میں وہ تمام مصالحے ڈال دیئے، جو ایک جھولا کیا اگر بمبئی سے لندن تک کا سفر کرڈالو تو قے نہ ہونے دے۔

آموں کی جھلیاں رکھی ہوئی تھیں۔ جامنوں کے ٹوکرے دھرے ہوئے ہیں جھولے جھول رہی ہیں اور کھا رہی ہیں۔ مل رہی ہیں اور گا رہی ہیں۔ یہ سب کچھ میسر ہے باغ باغ نہال نہال ہیں۔ مگر معاملہ کی بات یہ ہے کہ باپ بھائی، دیور جیٹھ ساس خسر کی آنکھوں کے سامنے تنہا جلسوں اور اکیلے سفروں میں نہیں۔ جہاں کسی قسم کی روک نہ ٹوک اور پوچھو تو نہ گچھ خدا غریق رحمت کرے مرنے والوں کو آدمی نہیں فرشتے تھے کہ اگر ملک موجودہ ترقی نہ کرتا تو ان کے بوٹے بوٹے صحیح سدا بہار پھول بن سکتے۔

ذرا اس تعلیم کو ملاحظہ فرمائیے کہ جھولے کے گیت لڑکیوں کو کیا تعلیم دے رہے ہیں وہ جھول رہی ہیں۔ چار پانچ جھلا رہی ہیں۔ اور گیت اس طرح شروع ہوتا ہے۔

پیاسے کو پانی پلا میری گوری تو راہ مسافر جان

کنوئیں پر لڑکیاں پانی بھر رہی ہیں ایک مسافر تھکا ہارا آنکلا۔ دیکھتا ہے تو ایک لڑکی نشۂ شباب میں چور ڈول کھینچ رہی ہے ٹھٹک گیا اور کہنے لگا۔

مو مسافر کے راستہ کی تکان محسوس کر اور گوری تھوڑا سا پانی پلادے پیاسا ہوں

دور ترقی نے مرد اور عورت کی خصوصیت کو مٹا دیا۔ اور روز بروز مٹ رہی ہیں۔ اس وقت ہر مرد اور عورت کو خلیق ہونا ضروری ہے جاہلوں کی کوشش تھی کہ لڑکیاں غیر مردوں کے ساتھ کج خلق ہوں ان کو کسی

غیر مرد سے خندہ پیشانی سے بات کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ لڑکی پانی کی جواب میں انسانیت کو ہاتھ سے نہیں کھوتی۔ ڈول رسی چھوڑ الگ کھڑی ہو جاتی ہے۔ مگر چونکہ اس کے طریقہ سوال پہ شبہ ہوتا ہے اس لئے کہتی ہے۔

بھر پیو چھیلا بھر پیو۔ میری صورت نہ دیکھ نہ بھول
جس رے سوامی کی میں بالی بھوریا تو تجھ سے راج مزدور

بحث ردیف قافیہ کی نہیں۔ میں نے عورتوں کی زبانی سنا ہے مجھ تک پہنچتے پہنچتے بہت کچھ تبدیلی ہوگئی ہوگی۔ ذکر مضمون کا ہے مسافر کی صعوبت کے خیال نے یہ جواب دلوایا "خود بھر لو" مگر شبہ نے فوراً کہلوایا کہ میری صورت پر نہ بھولیو، میں جس کی ملکیت ہوں اس کے ہاں تجھ جیسے راج مزدور ہیں۔

مسافر بھی ایسا ویسا تھا کہتا کیا ہے۔

چلی جاری گوری پاتری اور مت کر سان گمان
جس ری گوری کے ہم بانے سلوریا تو تجھ سی بھریں پینا

لڑکی نے پانی کا گھڑا اٹھا لیا تھا۔ کہتا ہے " جا چلی جا۔ تجھ ایسا خیال نہ کیجیو میں جس کا شوہر ہوں اس کے ہاں تجھ جیسی پانی بھرتی ہیں " یہ جواب ہے اس کا کہ میرے شوہر کے ہاں تجھ جیسے راج مزدور ہیں۔

لڑکی چلی جا رہی تھی کہ مسافر کو پھر کچھ خیال آیا اور کہنے لگا۔

گوری کا ہے کا تیرا گھڑوا اور کا ہے کا تیرا ڈول
کا ہے کی تیری انڈوی رے تو کیا ہے تیرا مول

" تو جو ایسے نکتوڑے توڑتی ہے تو کس برتے پر؟ ایسا تیرا گھڑا تیرا ڈول تیری انڈوی ہے کا ہے کی " اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ گیا کہ ان چیزوں کے ساتھ تیرا اپنا مول کیا ہے "

لڑکی مسافر کی سب باتوں کا جواب اس طرح دیتی ہے۔ اور اپنا مول کیا خوب بتاتی ہے

سونے کا میرا گھڑوا اور روپے کا میرا ڈول
رتن جڑاؤ میری انڈوی رے تو سوامی پریتم میرا مول

مسافر جل کر فرماتے ہیں۔

مٹی کا تیرا گھڑوا اور چمڑے کا تیرا ڈول
گھانس پھونس کی تیری انڈوی تو دو کوڑی تیرا مول

اس کے بعد لڑکی مسافر کی بات کو قابل جواب نہیں سمجھتی اور

بھر گھڑوا وہ لے چلی اور چڑھ گئی تال پہ تال

یہ واقعہ ایسا نہ تھا کہ ترقی یافتہ خواتین کی طرح جاہل عورت پی جاتی۔ وہ حرف بحرف ساری کہانی جا کر ساس کو سناتی ہے اور کہتی ہے۔

ساس! تیلی سی گھوڑی پاتلی اور پاتلیا ہے سوار

اب مسافر کا پتہ دیتی ہے ساس سن کر اچھل پڑتی ہے اور کہتی ہے "بیوقوف وہی تو تیرا شوہر ہے" ابھی ساس بہوؤں کی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ خود بدولت بھی آ گئے۔

برکھا کا سوامی آگیا اور آگیا تال تال   کوٹھے کے اندر پلنگ بچھا اور رکھ پر ڈال سفال

اب عورت پانی لے کر پہنچتی ہے اور کہتی ہے۔

"کیا تمہیں آئی نندیا اور کیا تمھیں چڑھا ہے خمار
دل کی گھنڈی کھول میرے پیارے اور رکھ سے ہٹا رومال"

گوری ناہیں آئی نندیا نہ ہمیں چڑھا ہے خمار
وہ وقت یاد کر دمیری گوری جو کنوئیں پہ دیدی ٹال

کیسا معقول جواب دیتی ہے۔

میں کیا جانوں میرا سوامی رے بھر جل دیتی بیلا ئے
سات برس کی میں بیاہی رے آئی بارہ برس پیچھے آئے

"مجھے کیا خبر تھی کہ میرا شوہر ہے۔ سارا گھوڑ قربان کر دیتی۔ سات برس کی بیاہی گئی اور آج بارہ برس پیچھے تم پردیس سے لوٹے۔ مجھے کیا معلوم کہ تم ہو۔" یہ ایسا جواب تھا کہ شوہر بیتاب ہو گیا۔ اور اب بی بی کو سینہ سے لگا کر کہتا ہے۔

گوری پیاری سانچے اتری اور ہاں تجھے گڑھا ہے سنار

"وہ بیوی تو سچی ہے اور عصمت کی کسوٹی پر ٹھیک اتری" اس صفت کو بیان کرنے کے بعد حسن ظاہری کے متعلق کہتا ہے کہ "تجھ کو سنار نے گڑھا ہے یعنی نہایت خوبصورت ہے۔ عورت جواب میں کہتی ہے۔

نا میں سانچے اتری اور نہ مجھے گڑھا ہے سنار
جنم دیا مائی باپ نے، تو روپ دیا کرتار

"میں کس قابل ہوں جو سچی نکلوں گی۔ اور سنار کی انگوٹھی بنوں گی۔ ماں باپ کے ہاں پیدا ہوئی۔ جو بری بھلی صورت ہے۔ یہ خدا نے دی"

میں کہتا ہوں جاہلیت عصمت کے متعلق ان کو زندگی کے ہر شعبہ میں کیسی تلقین کر رہی تھی۔ کہ اس تفریح میں بھی ان کے دلنشیں ایسی باتیں ہوتی تھیں آج ترقی جس طرح تمام جوہر مٹا رہی ہے اسی طرح وہ تمدن بھی فنا ہو چکا۔ لیکن یہ میرا یقین ہے کہ وہ وقت آئے گا جب ملک عہد گزشتہ کو سر پر ہاتھ رکھ کر روئیگا اور آج جس کو ترقی سمجھتا ہے۔ اس پر لعنت بھیجے گا۔ اور جس کو جہالت کہتا ہے اس کی تسبیح جپے گا۔

خطیب سنہ ۱۹ء

میاں مٹھو کی بکواس

ترقی کی صدائیں چاروں طرف سے کان میں آرہی ہیں۔ سنتا ہوں کہ تعلیم یافتہ لڑکیاں جہالت کا برقع اتار تہذیب کے زرق برق لباس سے آراستہ ہوگئیں۔ دیکھتا ہوں کہ جن سڑکوں پر دورویہ خودرو درختوں کی قطار خاموش کھڑی تھی، وہاں خوش نما پارک اور دلکش روشیں باواز بلند وقت کا راگ گارہی ہیں۔ کیسا تعجب خیز انقلاب ہے۔ جو باتیں نصف صدی پیشتر عیب تھیں وہ آج ہنر ہیں۔ جو جب باعث شرم وہ اب مایہ ناز!

قدیم سڑکیں اجڑ چکیں۔ سرسبز وشاداب درخت مٹ گئے۔ ہری ہری گھاس رنگ برنگ کے پھول آنکھوں کو خیرہ کر رہے ہیں۔ مگر ذرا مشرق کی طرف دیکھ اس لنڈے درخت کی سوکھی ہوئی ٹہنی پر ایک بڈھا پرندہ دورِ گذشتہ کا مرثیہ پڑھ رہا ہے۔ آواز دلکش اور نغمہ سریلا نہیں۔ مگر مٹنے والوں کی فانی یادگار ہے عقل سٹھیا گئی۔ دماغ چکرا گیا۔ سنو اور ہنسو۔

کدھر چلے؟ مکروہ آواز، لایعنی صدا! کیوں وقت ضائع اور دماغ پراگندہ ادھر آؤ کیسا پرلطف منظر اور دلکش سماں ہے۔ بیٹے کی شادی ہے۔ مہمان جمع ہیں۔ عالیشان مکان۔ اُجلا سفید فرش۔ میزیں کرسیاں۔ پیانو۔ ہارمونیم دلبستگی کے لئے تمام سامان موجود ہیں۔ صاف ستھری پڑھی لکھی بیویاں قرینہ سے بیٹھی معقول گفتگو کر رہی ہیں۔ غل نہیں غپاڑہ نہیں بچے نہیں کچے نہیں۔ مہذب

محفل، سنجیدہ باتیں، آنکھیں دیکھ دیکھ کر اور دل سن سن کر نہال نہال اور باغ باغ ہوتے ہیں! او ہو دولہا کی اماں تشریف لے آئیں! مہمانوں کا شکریہ ادا کیا لڑکیوں نے باجے سنبھالے۔ ترانہ کا مسدس پڑھا۔ موثر نظمیں ہوئیں قومی غزلیں ہوئی۔ کوئی دستور نہ رسم۔ ٹونہ نہ ٹوٹکا۔ برات کا وقت آیا۔ دولہا۔ دولہا کے ابا۔ دو چار اور مہمان باہر ہی باہر لڑکی کے ہاں جا نکاح پڑھ دلہن بیاہ لائے

کیسا سیدھا سادھا طریقہ ہے یہ شادی یقیناً یہ حق رکھتی ہے کہ اس کے حالات اخبار اور رسالوں میں شائع کئے جائیں تاکہ دوسری بہنوں کے واسطے نمونہ ہو دولھا غریب کی چھٹی آج ہی ختم ہے۔ دیکھو فلم کے یہ معنی ہیں۔ انسانیت اسکا نام ہے چلتے وقت لڑکے نے ماں اور باپ دونوں سے ہاتھ ملا کر شکریہ ادا کیا۔ بہن بھائیوں کی تکلیف کا اعتراف کیا۔ اور دولہا دلہن رخصت ہوئے۔

سبحان اللہ کیا اچھا سماں ہے۔ کسے امید تھی کہ قوم تاریکی کے غاروں سے نکل کر تہذیب کے محلوں میں اس طرح جلوہ گر ہوگی۔ خدا برکت دے ان دماغوں میں ان دلوں میں، ان ہاتھوں میں۔ جن کی بدولت مسلمانوں کے تمدن کو یہ چار چاند لگ گئے اور جاہل لڑکیاں تہذیب کے زیور سے ایسی آراستہ وپیراستہ ہوئیں۔

کھسکے کہاں! اس بڈھے طوطے کی بھی تو ٹیں ٹیں سن لو۔ جی تو گھبرائے گا۔ اول تو صورت ہی جھرکنوں کی ہے بال اور پر سب جھڑے ہوئے۔ دوسرے مسکن تو وہ نورٌ علیٰ نور۔ سبز پتے کا نام نہیں کھڑ ننگ ٹہنا۔ وٹا لکڑ۔

"کیوں میاں مٹھو کیا حال ہے!"

"بنی جی بھیجو"

میاں مٹھو یہ پرانے راگ کب تک گاؤ گے۔ اب اللہ دے کا وقت ہے نہ بنی جی بھیجو کا۔ اب تو یہ کہو "ترقی کرو" دیکھو میاں مٹھو سامنے شادی کا مچ رہی ہے

کیا مزہ آ رہا تھا۔"

میاں مٹھو نے سفید پلکوں میں نیلے نیلے دیدے بدلے اور کہا۔

"بنی جی بھیجو۔"

"مٹھو ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔"

مٹھو سامنے آئے قہقہہ لگایا اور کہا۔

اس تہذیب اور ترقی کا انحصار بچوں کی قلت پر ہے بچوں نے اسی لئے اجلے محفلیں اسی لئے ستھری، کپڑے اسی لئے نفیس اور مجلسیں اسی لئے خاموش ہیں۔ بچے کیسے ہی مہذب اور کتنے ہی تمیز دار کیوں نہ ہوں، ان کی موجودگی کا اثر کچھ نہ کچھ پڑے اور ضرور پڑے۔ ضرورت تھی کہ لڑکیاں پہلے بچوں کی پرورش سیکھتیں مگر انھوں نے الٹا راستہ سیکھا۔ کیا تم نہیں دیکھتے اور نہیں سنتے کہ مہذب بیویاں اور معقول شوہر بچوں کی پیدائش سے گھبرا رہے ہیں۔ اور ان لوگوں کو چھوڑ کر جہاں روپئے کی ریل پیل ہے، پیدائش مصیبت سے تعبیر کی گئی ہے۔ اور قریب فیصلہ ہو گیا ہے اور ہو گیا ہے، ظاہر ہے کہ بچوں والیاں کسی جلسہ کی شرکت کسی محفل کی شمولیت اگر کریں تو خود بدمزہ ہونے کے علاوہ اپنے بچوں سے دوسروں کو بھی بے لطف کر دیں گی۔ اور جب قومی ترقی بغیر نسوانی کوشش کے ممکن نہیں تو اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ بچے اس راہ میں حائل ہوں گے۔ میں حاشا وکلا جانور ہو کر آدمیوں پر اور آدمی بھی مہذب معترض نہیں مگر ایک بات کہہ رہا ہوں۔ ہے تو بالکل بجا اس لیکن پہلے سن لو پھر رائے دینا۔

لڑکیوں نے ترقی کا سبق مغرب سے سیکھا۔ بجا کیا، درست کیا۔ خوب کیا مناسب تھا، مصلحت تھی۔ ضرورت تھی مگر سب سے مقدم بچوں کی پرورش

کا سبق یاد کرنا تھا۔ دوسرا قدم ترقی کا ہوتا تو مجھ جانور کی رائے میں ادنیٰ تھا۔
تم کو مجھ سے زیادہ معلوم ہوگا کہ یورپ میں شرح پیدائش روبہ تنزل ہے فرانس
اس مصیبت کو پیٹ رہا ہے۔ اور اس آفت کا علاج کثرت ازدواج کے سوا
کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ نصف صدی سے برطانیہ بھی اس مرض میں مبتلا ہے
ان حالات میں مجھ کو حق تو نہیں ہے۔ مگر جانور کی بات پر کبھی فرصت میں
غور کرنا اور ایک مہذب بیوی سے بڑھاپے میں پوچھنا کہ بیگم تمہاری اماں
کتنے بچے چھوڑ کر مریں۔ اور نانی کتنے۔ اب تم کتنے چھوڑو گی۔ قدرت کا منشا
انسانی منتہیٰ ہے محض بقائے نسل ہے۔ تم نے ترقی کی تو خوب کی۔ مگر قدرت کا
منشاء کہاں تک پورا کیا۔ اور اگر تہذیب و تمدن اسی رفتار سے بڑھا تو تین چار صدی
ہندوستان کی سرزمین پر جہاں آج سات کروڑ کے قریب مسلمان ہیں۔ کتنے مسلمان
ہوں گے۔ گستاخی ہوئی گستاخی معاف کیجئے۔ معاف کیجئے۔ توبہ توبہ

نادم و شرمسار۔

جی ہاں میں نے بھی شادی دیکھی۔ ماشاءاللہ۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے
کہ آپ اتنی ترقی کر گئے کہ وہ بیہودہ رسمیں جنھوں نے برباد کر رکھا تھا نیست و نابود
ہوگئیں۔ اور مرد تو مرد عورتیں تک قوم کی پستی اور ذلت کو محسوس کرنے لگیں مگر
بھائیوں کیچڑ کا کیڑا تو کیچڑ میں ہی خوش ہے۔ قائین کی قدر کیا جانے۔ میری
بے ادب زبانی معاف کرنا۔ میں نے تو جاہلوں میں وہ کچھ دیکھ لیا کہ یہ تمہاری تہذیب
اور کنڈر گارٹن ہزار دفعہ قربان نعوذ باللہ لاحول ولا قوۃ معاف فرمائیے۔
بے ادبی ہوئی۔ اچھا ذرا عالم خیال میں میرے ساتھ ایک تماشہ دیکھیے میری
زبان سے اور اپنی آنکھ سے۔
بھان متی کا تماشہ اور مداری کا سوانگ۔ ہے مزیدار بھی اور کارآمد بھی چند

سے بیٹے کی وقعت معلوم ہوتی ہے۔ ان سگھڑ بیویوں کی قدر تم کو ان پھوہڑوں کے حالات سے معلوم ہو گی۔ جن سے الحمد للہ دنیا پاک ہوئی۔ مگر کیا کروں میں نے توان کا نمک کھایا ہے انہیں کے گیت گاؤں گا۔ بڈھا ہوں، حافظہ خراب ہو گیا بات یاد نہیں رہتی۔ میں نے شاید ابھی تم سے کہا ہے کہ نسوانی زندگی کا پہلا قدم بچوں کی پرورش اور دوسرا ترقی ہوتا۔ جانوروں کی رائے کیا۔ غلط، یقیناً غلط۔ مگر جو دیکھا ہے وہ کہتا ہوں۔ پھوہڑیں جہالت یعنی خدا کی عظمت کا سکہ معصوم دلوں پر بٹھانا فرض سمجھتی تھیں۔ یہ کوشش یعنی مذہبیت بھی تو فضول۔ اس خیال میں تم سے متفق ہوں۔ مگر تھوڑی دیر کو مسجدوں میں گھما گھمی اور گھروں میں اللہ کا نام جپ لیا جاتا تھا۔ کھیل تھے وہ اسی قسم کے۔ کہانیاں تھیں وہ اسی ڈھنگ کی۔ معاملہ تھے وہ اسی وضع کے۔ باتیں تھیں وہ اسی طرح کی۔ یہ تھی تو لغویت آج میں خود سمجھ رہا ہوں۔ لیکن اس لغویت میں کچھ انسانیت بھی تھی۔ مجھ میں اب طاقت پرواز نہیں۔ ایک پھوہار دے تو تیں کر کے رہ جاؤں گا۔ میں ان کا مداح نہیں تمہارا ہمنوا ہوں کس قدر بیوقوف تھیں کہ جن بھوت کا کھٹکا۔ والدین حیاتی اور بی شادی کا اندیشہ گھٹی میں ڈال کر مردوں کو عورتوں سے بدتر بنا دیتی تھیں۔ مگر جس چیز کو مدیر کہتے ہیں اس پر حرف نہ آنے پاتا تھا مقصد صرف یہ تھا کہ لڑکے ماں باپ کی آنکھ سے غروب آفتاب کے بعد اوجھل نہ ہونے پائیں۔ یہ کمزوری شادی کے قابل ہونے سے شادی ہونے تک ان کے چال چلن کی پوری محافظ اور کافی نگراں تھی۔

بی جی پھپھو۔ مدد اللہ کی۔۔۔۔ توبہ توبہ معاف کیجئے۔

اچھا تو اب تم ہنسو اور میں روؤں۔

دیکھو کیسی سیاہ اودی گھٹا سامنے سے جھوم کر اٹھی۔ خلوص کے بھرے ہوئے بادل بساط اسلام پر دوڑتے پھر رہے ہیں قلوب نسوانی کی سرسبز کھیتیاں جو خوف و

رجا کے جھگڑوں سے پامال ہو چکی تھیں آسمان کا منہ تک رہی ہیں۔ رحمت کی ٹھنڈی ہواؤں اور میٹھی صداؤں نے دل کے کنول کھلا دیئے لو پھوار شروع ہو گئی بس جل تھل ہوا۔ وقت کا خیال چھوڑ دو اور دماغ کو نصف صدی پیچھے ہٹا لو۔

مذہب کی خوشنما پریاں فضائے عالم میں اڑ رہی ہیں۔ دنیائے نسواں ان کے سایہ میں توحید کے نغمے گا رہی ہے۔ خلوص کی روشنی سے در و دیوار جگمگا اٹھے ہیں چھوٹا، بڑا، مرد، عورت ہر متنفس اس مقدس ہستی کے نام پر فدا ہے، جو حلیمہ کے دودھ سے پروان چڑھی۔

گریبان میں منہ ڈال کر کہو۔ یہ دور جہالت ہے؟ ان عورتوں کے دلوں میں ان کے کچے پکے گھروں میں ترقی کے نعرے اور ہمدردی کی لن ترانیاں نہیں انکے دل نور اسلام سے روشن۔ ان کی زبانیں خلوص سے آراستہ اور انکے سینے نور انسانیت سے چمک رہے ہیں۔ تمہارے محل دو محلے۔ تمہاری قصر اور منزلیں ان شکستہ دیواروں پر فدا ہوں گی، جہاں کلام الٰہی کے دریا حدیث نبوی کی لہریں لے رہی ہیں۔ تم ان گھروں کو اس سرے سے اس سرے تک دیکھ جاؤ چپہ چپہ چھانو اور کونہ کونہ ڈھونڈھو تم کو ایک صورت بھی نفسانیت میں غرق نظر نہ آئے گی۔ یہ وہ ہیں جنھوں نے اپنی زندگیاں شوہروں کی راحت پر قربان کر دیں۔ یہ وہ ہیں جنھوں نے کڑکڑاتے جاڑوں میں یہ چلچلاتی دھوپ میں دکھ میں سکھ میں تندرستی میں بیماری میں شکر کے سوا دوسری بات نہ کہی۔

ان کی مقدس روحوں پر سلام بھیجو اور کہو خوش تھیں وہ مٹنے والی جو خود فنا ہو گئیں۔ مگر ان کے نام زندہ اور کام باقی ہیں۔

چلو میرے ساتھ چلو میں بھی ایک شادی دکھاؤں۔ دیکھو یہاں بھی بیٹے کا بیاہ رچ رہا ہے مہذب شادی دیکھ چکے یہ جاہلوں کی شادی بھی دیکھو وہاں

پیانو اور سدس تھا۔ ہارمونیم اور ترانہ تھا یہاں دائرہ اور گیت ہیں۔ دف اور سہاگ ہیں۔ میں شرع کا نام لوں گا تو گردن اڑا دینا۔ مگر ایمان سے کہنا ایسا فنا فی القوم ہونے کا دعویٰ کہ دولہا کے زنانہ میں داخل ہوتے ہی ہارمونیم کی یہ لے اور گانے والی کی یہ صدا کہ۔

سینہ کوبی میں رہے جب تک کہ دم میں دم رہا
ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا

کہاں تک جائز ہے؟ لو اب جاہلوں کی بکواس سنو۔

"بنا بنڑی کے لئے سبھ گھڑی آیا ری بنا"

تم کہو گے یہ شبھ گھڑی ہندوؤں کے تمدن کا اثر لغویت نہیں تو کیا ہے میں کہتا ہوں مستقبل کے لئے نیک فال ہرگز نہیں۔ سب سے پہلی بات دولہا کے داخل ہوتے ہی جو اس کے کان میں پڑتی ہے وہ کس قدر خوشگوار ہے۔

"بنا بنڑی کے لئے سبھ گھڑی آیا ری بنا"

اس کو عمر بھر ان الفاظ کی لاج رکھنی ہے!

تجھے یہ بھی خبر ہے یہ کون کہہ رہا ہے؟ دلہن کی ایک سہیلی۔ کیا تم اس جذبہ کی جو ایک ساتھ کی کھیلی بچپن کی سہیلی کے دل میں اس لئے کہ اس کی شادی ہو چکی ہے پیدا ہوا داد نہ دو گے؟ وہ اس کا اظہار اس طرح کرتی ہے۔

یہ میرا ہریالا بنا یہ مرادوں پایا بنا
بنا بنڑی کے لئے شبھ گھڑی آیا ری بنا

کہہ رہی ہے کہ یہ شادی معمولی بات نہیں۔ اے دولہا تیری مدتوں کی مراد تھی، جو خدا نے آج پوری کی تو جبتک زندہ ہے اور جس وقت تک یہ، اس بات کو یاد رکھ دبی زبان سے یہ اشارہ کرنے کے بعد اپنی سہیلی کی طرف سے دولہا کے

حسن کی تعریف کرتی اور اس سلسلہ میں ایک عجیب معاملہ نہایت خوبصورتی سے بیان کرتی ہے۔

دولہا کی اماں بھی بنی دولہا کے ابا بھی بنے
چل کے دیکھو ری سکھی سب میں سوا یاری بنا

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا دلہن کے ماں باپ نے کپڑے وغیرہ نہ بدلے تھے جو وہ صرف دولہا کا مقابلہ اس کے والدین سے کر کے اس کو ترجیح دیتی ہے جواب یہ ہے کہ جس وقت کا وہ ذکر کر رہی ہے اسوقت کی ایک جاہلانہ رسم یہ بھی تھی کہ دلہن کی ماں دولہا کی ماں کے کسی عزیز کے سامنے نہ آتی تھی اور اس لئے کپڑے بدلتی تھی نہ سرگوندھتی تھی۔ بڑی وجہ یہ تھی کہ جہیز کے دینے والانے میں جسمیں ہر قسم کا بھانڈا بھی شامل تھا کپڑوں کے خراب ہونے کا احتمال تھا اور باعتبار تعلق ایک قسم کا حجاب سا بھی تھا۔ نہ زنانے میں ماں سامنے آتی تھی نہ مردانے میں باپ دکھائی دیتا تھا۔ لیکن یہ ضرورت کہاں تک اور حجاب کب تک۔ اس لئے چوتھی میں "سمدھن بلاوا" ہوتا تھا اور دونوں سمدھنیں بیٹے کی ماں اور بیٹی کی ماں گلے مل کر خدا سے دعا مانگتی تھی کہ یہ تعلق بہ خیر و خوبی انجام پائے۔ مجھے اس وقت اس رسم پر بحث کرنی ہے مگر تم نے دیکھا کہ وہ سہیلی کس مزے سے کہہ رہی ہے۔

"چل کے دیکھو ری سکھی سب میں سوا یاری بنا"

اب آگے بڑھو تمہارا وقت تو ضرور ضائع ہو رہا ہے۔ مگر کیا کروں مجھے ایک خاص قسم کا لطف آ رہا ہے۔ ہائے مشرق تیرے سب جوہر فنا ہو گئے اور ملک اس پر فخر کر رہا ہے۔

یہ تو تم بھی جانتے ہو کہ میزبان مہمان کے سامنے انواع واقسام کے

کھانے رکھ کر بھی کسر نفسی سے "دال دلیا" ہی کہتا ہے۔ لیکن اس دلہن کی سہیلی دنیا سے الٹی بات کہہ رہی ہے۔

سجیں مخمل کی بچھیں تکئے مشجر کے لگے
نور کے تنبو تلے لا کے بٹھایا ری بنا

میں ایک بات اور عرض کردوں۔ ذرا اپنے قہقہے کم کیجئے اور سن لیجئے دور جہالت میں ہر غریب سے غریب اور فقیر سے فقیر کو یہ حق حاصل تھا کہ بیٹی کے بیاہ میں امیر سے امیر اور بڑے سے بڑے آدمی کے گھر سے بلا تکلف مسند اور تکیہ منگوائے یہ مسند اور تکیہ علی العموم مخمل اور مشجر کا ہوتا تھا۔ لیکن اگر محلہ بھر میں موجود نہیں ہے اور کہیں سے میسر نہ آسکا تو وہ یہ کہہ رہی ہے کہ ہماری یہ معمولی چیزیں بھی مخمل اور مشجر سے کم نہیں۔ کیونکہ ہم کو یہ اعتراف ہے کہ تو یہ حق رکھتا ہے۔ اور ہمارے دل میں تیری عزت کا یہ احساس موجود ہے۔ مگر ہم مجبور ہیں تو اس معمولی گودڑ کو بھی مخمل اور مشجر سمجھ۔

ماشاء اللہ سمجھ دار ہو۔ مہذب ہو۔ ذرا بتاؤ تو سہی نور کے تنبو سے کیا مقصد ہے۔ خاموش کیوں ہو گئے۔ میں بتاؤں یہ سنت رسولؐ ہے۔ ہنستے کیوں ہو یہ جاہلوں کا حسن عقیدت تھا۔ ان جاہلوں کا جن کی رگ رگ میں اسلام موجود تھا فقط دعویٰ نہ تھا۔

اکتا کیوں گئے۔ میں خود اپنی ٹر و اس ختم کر رہا ہوں۔ اجازت ہو تو ایک بات اور کہہ دوں۔ دیکھو مذہب اس کا نام ہے۔

ماں کے قدموں میں گرا باپ کی چھاتی سے لگا۔
بہنوں کے آنچل تلے کھیلتا آیا ری بنا

خدارا یہ جو خوشی کی گھڑی دکھائی دی کہ وہ گوشت کا لوتھڑا جو مکھی اڑانے

کے قابل بھی نہ تھا آج اس لائق ہوا کہ دولہا بنے اور جوان ہو تو سب سے پہلے ان قدموں میں گرتا ہے جو جنت ہیں۔ اس کے بعد باپ کی چھاتی سے لگتا ہے۔

کیا اس تخیل کی جس میں مراتب کا اس قدر اچھا لحاظ رکھا گیا تھا داد نہ دوگے؟۔

تم پیٹ بھر کر ہنس لو ایک بات اور کہوں گا۔ جہالت کی ایک رسم یہ بھی تھی کہ جب دولہا زنانہ میں آتا ہے تو بہنیں اپنے دوپٹوں کے آنچل اس کے سر پر ڈال کر اندر لاتی تھیں۔ مجھے اس رسم سے مفصل بحث کرنی نہیں۔ صرف اتنا کہتا ہوں کہ بہن بھائیوں کے جوش محبت کو ترقی دینے کے علاوہ اس میں خاص مصلحت یہ تھی کہ خاص گرمی کا موسم ہے۔ دولہا گھنٹوں سے کپڑے پہنے جکڑا بیٹھا ہے۔ بہنوں کے آنچل چھتری کا کام دیں گے اور دھوپ کی زحمت سے محفوظ رہے گا۔

نبی جی بھیجہ۔ مدد اللہ کی
ٹیں ٹیں ٹیں

عصمت ۲۰ء

وفا کا تاج

بہار کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ چاندنی رات اور ٹھنڈی ہوا دنیا والوں کے واسطے جنت کا نمونہ تھی۔ اس رفیق کی یاد جو بیس سال ہمدم و غمگسار رہا آبادی سے قبرستان لے گئی۔ وہ آرام گاہ جس میں سلمان ہمیشہ کے واسطے میٹھی نیند لے رہا تھا آنکھ کے سامنے تھی۔ سرو کے پتے میٹھے اور سریلے سروں میں کہہ رہے تھے۔

"اے مٹی کو پوجنے والی بیگم! رشتۂ محبت ٹوٹ چکا۔ جا جا ادھر ادھر کا رُخ نہ کر۔"

مشرق سے ہوا کا ایک جھونکا آیا اور یہ آواز سنائی دی۔

"حمیرہ! آسمانی فرشتے اور ہوائی چڑیاں تیرے گیت گا رہی ہیں تیرے سر پر وہ تاج ہے۔ جس میں خلوص اور وفا کے جواہرات قیامت تک جگمگاتے رہیں گے۔"

عصمت ۱۹۱۰ء

مشرقی بہنیں

بڑھیا سہیلیوں کی خط و کتابت

سلمہ بہن! تمہارا حکم ٹالتی تو رہتی کہاں۔ بی نصیرہ کے ہاں گئی اور سر آنکھوں سے گئی۔ مگر بُرا نہ ماننا شادی کیا ایک بیگار تھی کہ گھبرا پیپکی کر کرا الگ کی اور بیٹی کیا انگنائی کا کوڑا تھی کہ جھاڑ دے دلا نکال باہر کیا۔ منگنی، مائیوں، جوڑا جہیز داخاک بھی تو کچھ نہ ہوا۔ موئے غریب مفلس بھی تو بیٹی کا مان رکھ لیتے ہیں ہزاروں لاکھوں کے آدمی اتنے بڑے عزت دار گاؤں گوریا۔ جائداد املاک، اللہ کا دیا سب کچھ، اور ایک بات ڈھنگ کی کرنی نصیب نہ ہوئی۔ جو رسم ہے وہ فضول اور جو دستور ہے وہ غلط۔ جانتی ہوں کہ تم بھی آخر جنٹ صاحب ہی کی بہن ہو، ان ہی کی سی کہو گی۔ مگر سلمہ منھ پر آئی نہیں رکھتی ایسی عقل بھی کس کام کی کہ تمام دنیا میں تھڑی تھڑی ہو جائے اور کان پر جوں نہ چلے۔ اللہ آمین کی بیٹی اور داماد تک کو جوڑا نصیب نہیں بتاؤ تو سہی ناک رہی یا کٹی؟

کیوں بوی! جب مائیوں معیوب۔ ساچق گناہ۔ چوتھی کفر، چالے حرام تھے تو یہ پارٹی کہاں سے جائز ہو گئی؟ جب یہ روپیہ کا اٹھانا ہی فضول خرچی تھی تو یہاں کیوں صرف ہوا۔ یا وہاں روپیہ سونے کا تھا اور یہاں مٹی کا؟ نمود سے بچنا تھا کہ رقم ضائع نہ ہو۔ تو یہ انگریزی باجے کل کی گاڑیاں بجلی کی روشنی کیا الفت آگئی تھی؟ کچھ بھی نہ ہوتا تو صبر آجاتا۔ شکوہ نہ شکایت۔ بدنامی نہ ذلت مگر اب تو میں کیا۔ دنیا بھر یہی کہے گی کہ کیا کرنا نہ جانا۔ روپیہ کے متعلق

تو بحث ہی نہیں۔ میں آپ کہتی ہوں جو بجے وہ اچھا، جو رہے وہ بہتر۔ مگر اسکا
کیا جواب دیتی کہ نہ کیا جو کرنا تھا اور کیا جو نہ کرنا تھا۔ انگریزی کا اثر ایسا چڑھا
کہ اپنے ذاتی جوہر بھی کھو بیٹھے۔

آخر تم بھی تو غدر میں خاصی گیارہ برس کی تھیں۔ خود دلہن بن چکی ہو۔
بیسیوں بنائیں سینکڑوں دیکھیں۔ ایمان سے کہنا کیا وقت تھا۔ وہ جھکی جھکائی
دبکی دبکائی دلہنیں تو اب دیکھنے ہی میں نہیں آتیں۔ ایک یہیں کیا جدھر
دیکھتی ہوں عالم ہی اور ہے۔ ایک وہ دن تھے برسوں بہو کی آواز کان
میں نہ آتی تھی۔ ایک آج کا دن ہے کہ ادھر بہو آئی اور ادھر سکھو لو میاں
مقنع اور گھر سنبھالو اپنا" عورت کا سب سے بڑا سلیقہ، سب سے اچھا زیور
سب سے بہتر جوہر شرم و حیا ہے۔ بوی یہی وجہ تھی کہ اگلے لوگ دنوں بہو کا
گھونگھٹ نہیں اٹھاتے تھے۔ مہینوں کی بیاہی بھی سکڑی سکڑائی اِدھر اُدھر
ہوئے ہوئے پھرتی ہوئی اچھی دکھائی دیتی تھی۔ یہ تو معلوم ہوتا تھا کہ اس گھر میں
بہو آئی ہے! اب تو آئی بھی تو بہ حقاقہ و قاقہ۔ چیر و تو چار نچھاور تو پانچ تڑاق
پڑاق۔ یہ جا وہ جا غضب خدا کا چوتھی کی دلہن دو دن کی بیاہی اور بیٹھی میاں
کے رومال پر نام لکھ رہی ہے۔

کچھ ایسا زمانہ پلٹا کہ وہ بات ہی نہ رہی۔ تعجب تو یہ ہے کہ جن رسموں پر
آج چاروں طرف سے لعن طعن اور لے دے ہو رہی ہے۔ ان میں بعض تو
کیچڑ میں دبے ہوئے ہیرے ہیں۔ مسلمہ ہمارے بڑے بیوقوف نہ تھے
جو باتیں مقرر ہیں ایسی جانچ تول اور کس پر رکھ کر کہ جس وقت یہ بالکل نیست و
نابود ہو جائیں گی اس وقت انکی قدر معلوم ہوگی۔

آج جبکہ آزادی کی ہوا بھی نہیں جھکڑ چل رہے ہیں مائیوں بٹھانا ظلم

کہا جاتا ہے۔ مگر میں تو ہانکے پکارے کہتی ہوں کہ جو لڑکی چار دن میں میکے سے نکل کر سسرال جانے والی ہے۔ اس کا باپ بھائیوں کے سامنے خوش خوش پھرنا اور جنہوں نے پال پوس کر اس لائق کیا۔ ان کی جدائی سے تیوری پر بل تک نہ لانا کیسی بُری بات ہے اسی کا نام شرم و حیا ہے کہ اس کے خیالات کا اظہار عام طور پر نہ ہو۔ رنگ نکھرنے اور خون بڑھنے کے لئے غیر معمولی خوراک ابٹنے اور خوشبوؤں وغیرہ کا استعمال کھلم کھلا کرنا بے حیائی نہیں تو بے حیائی کے سر پر کیا سینگ ہوتے ہیں۔ خیالات کے یکسو اور آنے والے وقت کے تمام نشیب و فراز پر خوب اچھی طرح غور کر لینے اور ہر پہلو پر نظر ڈالنے کا تنہائی سے بہتر کوئی اور ذریعہ ہو سکتا ہے تو مجھے بتاؤ سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ دلہن کو سسرال میں جا کر جھکنے کی خاموش بیٹھنے کی گھٹنے کی عادت پڑ جائے۔

سلمہ! خدا کی قسم بڑی بڑی ہرّ دنگیوں کے چہروں پر جو سارے سارے دن اور آدھی آدھی رات تک خاک اُڑاتی پھرتی تھیں کچھ ایسا نور برسنے لگتا تھا کہ غیروں کا دل دیکھ کر خوش ہو۔ خوشبو کی یہ کیفیت تھی کہ جدھر سے دلہن نکل گئی گھر بھر مہک گیا۔ اب تو وہ شہاب اور کسوم سب غارت ہو گئے۔ بہت کیا انگریزی شیشی کھولی اور چھڑک لی۔ تمہارے اپنے جہیز کا اگر کوئی پھٹا پھٹایا اُدھڑا اُدھڑایا کپڑا پڑا ہو تو سونگھ کر دیکھو پچیس چھبیس برس کے بعد اتنا پتہ دے رہا ہوگا کہ مجھے کسی دلہن کے زیب تن ہونے کا فخر حاصل ہو چکا ہے۔

ان ہی وقتوں کی پلی پلائی ایک میں بھی ہوں۔ گو بڑھیا پھونس ہو گئی قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں۔ مگر جاہل ہوں یا بیوقوف۔ یقین جاننا آج تک غیر مرد سے بات کرتے ہوئے جی ڈرتا ہے۔ میں مرنے کو تیار۔ ابا جان مرد سے بدتر مگر خدا گواہ ہے اگر کبھی آنکھ ملا کر بات کی ہو۔ آجکل کی لڑکیوں کو دیکھتی ہوں چوتھے میں

گیا پردہ۔ بھاڑ میں گیا لحاظ۔ رستہ میں فقیر ہے تو بلا سے۔ ڈیوڑھی پر نوکر بیٹھا ہے تو بیٹھنے دو۔ سرک دے سی اس گھر سے اس گھر اور اس گھر سے اس گھر ۔ رونا بھی آتا ہے ہنسی بھی آتی ہے۔ بی ذیلنب ماشاءاللہ یوں تو انگریزی اور فارسی سب میں طاق، جلسوں میں سب سے آگے۔ تہذیب میں سب سے اول مگر پرسوں جو ماما بیمار پڑ گئی اور چاول پکانے اٹھیں تو یہ تک خبر نہیں کہ پیا کر کھانڈ ڈالتے ہیں یا یوں ہی۔ ہوا پانی میں کھانڈ ڈال پتیلی کی پتیلی غارت کی۔

ہماری تو خیر جس طرح گذرنی تھی گذر گئی۔ مگر اس ننھی پود کا کیا ہوگا، جن کا دیدہ ابھی سے ہوائی ہو رہا ہے۔ خدا کی نہیں رسول کی نہیں۔ ماں سے لگاؤ نہ باپ سے تعلق۔ بڑوں کا ادب، نہ چھوٹوں کی محبت۔ غضب خدا کا ٹانگ برابر کی لڑکی اور گز بھر کی زبان۔ جمیلہ کل ماں سے کہتی ہے کہ "گڑیا میری تھی آپ کو مجھ سے پوچھنے کا کیا حق حاصل ہے کہ کیا کی؟"

بس بوا سلسلہ! چلنے کی تیاریاں کرو۔ اب دنیا ہمارے رہنے کی جگہ نہیں خدا عزت و آبرو سے اٹھا لے تو سب کچھ بھر پایا۔

عصمت ۱۹۱۰ء

پہلی بیویاں

ایسا تو کون ضدی ہوگا جس کو اس میں کلام ہو کہ ہماری پچھلی حالت اور اور اب کی حالت میں زمین آسمان کا فرق ہے یا تو تعلیم نسواں کے نام سے مسلمان ناک بھوں چڑھاتے تھے یا اب جا بجا مدرسے شہر بشہر انجمنیں قائم ہو رہی ہیں رسالے بھی نکل رہے ہیں۔ اخبار بھی شائع ہو رہے ہیں۔ کلب بھی ہیں سوسائٹیاں بھی ہیں۔ کتابیں بھی لکھی جا رہی ہیں۔ کورس بھی تیار ہو رہے ہیں۔ غرض علم کے جتنے ذریعے خیال میں آسکتے ہیں سب ہی سے کام لیا جا رہا ہے۔ ان ہی باتوں کا نتیجہ اور ان ہی کوششوں کا اثر ہے کہ لڑکیاں تھوڑی بہت پڑھی لکھی دکھائی دے رہی ہیں۔ پڑھنے کا انھیں چسکا لگ گیا ہے وہ اپنے وقت کو کم ضائع کرتی ہیں۔ لیکن باوجود ان سب باتوں کے جب ہم اگلی بیویوں کا مقابلہ کرتے ہیں تو چند ایسی باتیں اس وقت کی نظر آتی ہیں۔ جن کا اب پتہ نہیں۔ اور اگر بڑی پرانی بچی بچائی کہیں کچھ رہ بھی گئی ہیں تو روز بروز مٹتی جاتی ہیں۔ اور ایک وقت آئے گا کہ ہم میں ان باتوں کا نام و نشان تک نہ رہے گا لیکن کیا اچھا ہوتا اگر اس ترقی اور شوق ترقی کے ساتھ ہم اپنی اس وضع کو بھی ہاتھ سے نہ کھوتے اور ہماری طرز معاشرت میں اگر بعض باتیں نئی ہوتیں تو بعض پرانی بھی۔ ترقی کے یہ معنی تو شاید نہ ہوں گے کہ بیڈمنٹن یا

ٹینس وغیرہ کے شوق میں اپنی گڑیوں کو دیا سلائی دکھا دیں۔ بلکہ میری رائے
میں ترقی کا اصل منشاء یہ ہے کہ اگر اب تک بچیاں گڑیا کے گھر میں چراغ جلایا
کرتی تھیں، تو اب لیمپ جلانا بھی سیکھ لیں۔ بعض بھائیوں اور بہنوں کی
یہ کوشش ہے کہ ہماری پرانی عادتیں چھوٹ جائیں۔ اور ہم آنکھ بند کر کے
مغربی رنگ میں ڈوب جائیں۔ مگر وہ یقیناً غلطی پر ہیں۔ ہم لاکھ کوششیں
کریں عادتیں بدلیں، طریقے چھوڑیں۔ بالکل ہی مغربی کیوں نہ ہو جائیں۔
لیکن پھر بھی ہم سے یہ وضع قطع بہت مشکل ہے۔ ہماری مالی حالت ہرگز
اس قابل نہیں کہ ہم ان کا ساتھ دے سکیں۔ ہم ان ہی جیسے کیوں نہ ہو جائیں
پھر بھی حکمران نہیں ہو سکتے کہ روپیہ کی ریل پیل ہو جائے بھی اگر ضرورت ہے تو یہ کہ ہم مغرب
کے وہ طریقے جو ہم اچھی طرح نباہ سکیں اور جو درحقیقت مفید بھی ہیں۔ اور جن سے بہتر
اسی قسم کے طریقے ہمارے ہاں نہیں ہیں اختیار کر لیں۔ لیکن یہ ضرورت نہیں کہ گرمی میں
دوپٹوں کو خیرباد کہیں اور جاڑوں میں لحاف کے بدلے کمبل لازمی سمجھیں۔

جس طرح ہر انسان کی ہر عادت ہر شخص کی نگاہ میں اچھی نہیں معلوم ہو سکتی ایسا
کوئی ملک یا کوئی قوم جس کے تمام طریقے مقبول ہوں ہمارے لئے قابل تقلید نہیں ہمارے
بعض اگلے اصول موجودہ زمانہ کی رفتار کے موافق نہ سہی لیکن بعض ایسے ہیں کہ
اگر وہ ہاتھ سے جاتے رہے تو گویا ہم نے جان کر اپنے تئیں ایسا نقصان پہنچایا
جس کا کوئی معاوضہ نہیں ہو سکتا ہم تو اپنی اس دھن میں مست اپنا وقت پورا کر
چل بسیں گے لیکن وہ نسل جس کو ہمارے بعد دنیا میں آنا اور جس کا اس سے بھی بدتر
زمانہ سے پالا پڑنا ہے ہم کو کیا کہے گی؟

آجکل بعض لڑکیوں کا خیال ہے کہ قومی خدمات اور ہمدردی کا مادہ عورتوں میں
ضرور ہونا چاہیئے۔ اور جب تک تعلیم یافتہ نہ ہوں یہ عادت پیدا نہ ہو سکتی اس قسم

کے مضامین میں نے پڑھے ہیں جن سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ لیکن کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ اگلی بیویاں جن کا علم شُدہ بدہ تک محدود تھا ہمدردی سے بالکل محروم تھیں۔ اگر کوئی لڑکی یہ سمجھتی ہے تو یہ محض غلطی پر ہے۔ وہ بیویاں جن کی بابت یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہونا اپنا فرض سمجھتی تھیں ناممکن تھا کہ مصیبت زدہ کی داستان سن کران کا کلیجہ نہ کٹ جائے۔ چاہے ان پہ خود تکلیف گذر جائے مگر وہ اس کی مدد ضرور کریں گی گو زمانہ کی رفتار نے وہ ڈھنگ مٹا دیئے لیکن اب بھی ان سرکاروں کے نام موجود ہیں جن سے رانڈوں اپاہجوں دکھیاروں مصیبت ماریوں کو تنخواہیں ملی ہیں عصمت کی پڑھنے والی بیبیاں مجھے معاف کریں میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ آجکل تو سب سے بڑا فرض ترقی کرنا ہے جو شخص اس فرض کو ادا نہیں کرتا وہ عقلمند نہیں ہے۔ لیکن اس کا کیا جواب ہے کہ آجکل ترقی دنیا میں وہی شخص کر سکتا ہے جو اپنی غرض کو دوسروں کی غرض پر مقدم سمجھے وہ عورت جو اپنی مقررہ آمدنی میں سے مفلس رشتہ داروں۔ حاجت مندوں پڑوسیوں کی خدمت لازمی سمجھتی ہے وہ نہ روپیہ بچا سکتی ہے نہ جوڑ سکتی ہے نہ مالدار ہوگی نہ معزز سمجھی جائے گی۔

اگلی بیویاں خدا انہیں غریق رحمت کرے کفایت شعاری اپنا فرض منصبی سمجھتی تھیں۔ جو آگیا وہ کھالیا جو مل گیا وہ پہن لیا۔ لیکن وقت پر نہ ان کو کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا تھا نہ ذلت اٹھانی پڑتی تھی۔

بیٹی کا بیاہ ہے خرچ سر پر ہے۔ میاں پریشان ہے کہ کہاں سے لاؤں۔ بیوی کے پاس جو کچھ جمع جتھا ہوئی اس نے نکال سامنے رکھ دی میاں کا دل باغ باغ ہوگیا۔ پریشانی کا بڑا حصہ محض بیوی کی کفایت شعاری سے رفع ہوگیا آجکل ضرورت یہ ہے کہ کلب میں کسی سے کپڑے کم نہ ہوں۔ اور جو کہیں میلے ہوئے تو مس صاحب گھسنے کب دیں گی۔ غرض بڑی رقم تو بیوی کے کپڑوں ہی میں صرف ہوگئی جا ہے

میاں کی اچکن تین برس کی ہو مگر بیوی کی کلائی پر گھڑی ضرور ہو گی۔
مرنے والیاں کہتی تھیں "حق ہمسایہ ماں کا جایا"۔ بہت مشکل تھا کہ پڑوس میں فاقہ ہو اور وہ آپ اطمینان سے کھانا کھائیں۔ ان کے تعلقات، ان کا میل جول ان غریبوں کے ساتھ ایسا تھا کہ آج اپنوں میں وہ بات نظر نہیں آتی۔ کچھ تو تھا جس کا یہ نتیجہ تھا کہ کھانا نکالنے بیٹھیں، میاں کو دیا بچوں کو دیا آنکھ اٹھا کر دیکھتی ہیں تو ہمسائی کی لڑکی تتلا کر کہہ رہی ہے۔ "استانی جی اماں نے ذری سا سالن مانگا ہے۔ بھائی کی روٹی روکھی ہے۔"
اب یہ باتیں معیوب ہیں۔ اٹھ گئیں اور اٹھ رہی ہیں۔ آج جواب یہ ہو گا کہ "نہایت بے غیرت عورت ہے اسکو مانگنے کا حق کیا حاصل ہے"۔
مشکل کیا ناممکن تھا کہ دلچسپ سے دلچسپ مشغلہ بھی ان کی نماز میں رخنہ ڈال دے تلاوت قرآن ان کا ضروری کام تھا اور جب کاروبار سے یا، بچھونوں پہ سونے لیٹتی تھیں، اس وقت تک اپنے عزیزوں کو پڑھ پڑھ کر بخشا ان کا فرض تھا مذہب کے اعتبار سے ان کا یہ خیال صحیح ہو یا غلط، لیکن اگر غلط بھی تھا تو کیا اچھا غلط کام تھا۔
ان کے آگے دو چھوڑ چار مامائیں ہوں مگر وہ ان کی محتاج نہ تھیں۔ ان کو یہ دقت پیش نہ آتی تھی کہ آج ماما کو دیر ہو گئی تو بچے بھوکے مدرسے چلے جائیں اور میاں آدھا پیٹ کھا کچہری رخصت ہوئے۔ ان کی دسوں انگلیاں دسوں چراغ تھیں۔ وہ اچھے سے اچھا پکا سکتی تھیں۔ اور بہتر سے بہتر سی سکتی تھیں

عصمت ۱۹۱۱ء

جاہل بیویوں کی ایک جھلک

کل ایک صاحب جو عصمت کے قدیمی خریدار ہیں۔ مع اپنی بیوی کے مجھ سے ملنے تشریف لائے۔ میاں معزز عہدہ دار۔ بیوی تعلیم یافتہ۔ تمدن جدید رگ رگ میں بھرا ہوا تھا دو ڈھائی گھنٹہ تک بیٹھے رہے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ قدامت سے متنفر۔ جدت کے شیدا۔ تعلیم نسواں کے عاشق، پردہ پر معترض، یہ سمجھ کر کہ میں حقوق نسواں کا حامی اور تعلیم نسواں کا ساعی ہوں۔ اپنے خیالات کا اظہار فرماتے رہے۔ منجملہ دوسری باتوں کے دوران گفتگو میں یہ بھی فرمایا کہ

"آپ جیسے بزرگ کی کوشش سے لڑکیاں قید جہالت سے آزاد ہو گئیں وہ اپنے فرائض کو سمجھنے لگیں۔ پرانے گڑھوں سے نکل کر علم کے سایہ میں آگئیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ کس طرح اگلی عورتیں زندگی بسر کرتی تھیں۔"

میں نے ان کے بہت سے سوالوں کا جواب تو دے دیا۔ مگر اس خیال کے متعلق عرض کیا کہ اپنی رائے عصمت میں ظاہر کروں گا۔ چنانچہ ان کے سوال کا جواب دیتا ہوں۔

میں حقوق نسواں کا حامی ضرور ہوں اور چاہتا ہوں کہ جو حقوق شرع

اسلام نے عورتوں کو عطا فرمائے ہیں۔ وہ مسلمان نہایت فراخ دلی سے اپنی عورتوں کو دے دیں۔ جن گھروں میں بیویاں واقعی گھر کی ملکہ ہیں خدا انکے شوہروں پر رحمت و برکت نازل کرے گا۔ مگر میں چونکہ بدترین مخلوق ہوں اس لئے میری نظر سے وہی بیچاریاں گذرتی ہیں جو عطیہ اسلام سے محروم کردی گئیں۔ اس لئے میرا فرض ہے کہ میں جب تک زندہ ہوں، ان کے حقوق کی فریاد مردوں کے کان تک پہنچاؤں۔ اس سلسلے میں اخباروں سے رسالوں سے مضمونوں سے۔ کتابوں سے غرض جس طرح بھی ہوگا جب تک دماغ کام کررہا ہے۔ یہ صدا بلند کرتا رہوں گا۔

میں یقیناً تعلیم نسواں کا ساعی ہوں۔ اور عصمت اسی مقصد کے لئے آج قریب قریب دس سال سے جاری ہے۔ لیکن حاشا وکلا میں اس تعلیم کا ساعی نہیں جو آج کل تعلیم سمجھی جارہی ہے۔ میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ مسلمان لڑکیاں تعلیم کے واسطے غیر مسلموں کے سپرد کردی جائیں۔ میں اس خاص معاملہ میں یہانتک متعصب ہوں کہ میں یہ بھی روا نہ رکھوں گا کہ لڑکیاں ایک لمحہ کے واسطے بھی والدین یا سرپرستوں کی آنکھ سے اوجھل ہوں۔ اگر دوسرے ناظرین عصمت کا بھی یہ خیال ہے کہ میں موجودہ طریقہ تعلیم کو جائز سمجھتا ہوں تو یہ ان کی غلطی ہے۔

یہ ناقص تعلیم جس قدر قابل اعتراض ہو سکتی ہے۔ اس سے زیادہ وہ ذرائع قابل اعتراض ہیں جو تعلیم کے لئے استعمال کئے جارہے ہے۔ موجودہ تعلیم چونکہ مذہب سے علیحدہ ہے اس لئے اس کا پرچھاواں بھی مسلمان عورتوں کے واسطے سم قاتل ہے۔

ضرورت یہ ہے کہ ان کو جو کچھ پڑھایا لکھایا جائے۔ وہ سب دائرہ

مذہب کے اندر۔ دس پانچ یا سو پچاس خاص خاص لڑکیوں کو چھوڑکر عام طور پر وہ لڑکیاں جو تعلیم یافتہ سمجھی جارہی ہیں ان کی قابلیت صرف اتنی ہے کہ ٹوٹا پھوٹا خط یا غلط سلط مضمون لکھ لیں۔ اخبار اور رسالے بھی پڑھ لیں کتابیں دیکھ لیں لیکن اس قابل ہونے کے واسطے سب سے پہلے موجودہ طریقہ تعلیم کے سلسلے میں انکو مذہب کی قربانی کرنی پڑتی ہے اسلئے یہ سودا کسی اعتبار سے قابل توجہ نہیں اگلی بیویاں جو جاہل اور پھوہڑ سمجھی جاتی ہیں۔ ان سے بہت زیادہ پڑھی لکھی ہوتی تھیں اور سب سے بڑا جوہر مذہب تھا۔ وہ ان کے واسطے مایہ ناز ہوتا تھا۔

اگر تمدن جدید کی ظاہری خوبیاں جو پانی کے بلبلوں سے زیادہ پائدار نہیں فرصت دیں، تو آؤ میرے ساتھ آؤ۔ اشتیاق کی آنکھوں سے دیکھو حسن عقیدت کے قدم اٹھاؤ میں تم کو آج سے پچاس برس پہلے کا ایک گھر دکھاؤں۔

دیکھو یہ گھر والی بیوی باورچی خانہ میں بیٹھی ہیں۔ ان کے پاس گھڑی گھنٹہ نہ تھا مگر تاروں نے جھلملا کر ان کو آمد صبح کا پیغام پہنچایا اور یہ کلمہ توحید پڑھتی ہوئی بستر راحت سے اٹھ بیٹھیں۔ انکی زندگی کا پہلا کام خدائے برتر کے حضور میں سجدہ تھا عاجزی کے آنسوؤں سے رو کر، خلوص کی تمناؤں سے بلک کر اور محبت بھرے دل سے گڑگڑا کر دعا مانگی۔

"الہ العالمین اپنے حبیب کا طفیل۔ یہ صبح اطمینان سے شام اور یہ دن عزت و آبرو سے بسر ہوں۔ بچوں کی عمر میں برکت۔ ان کے باپ کی عزت میں ترقی، ہاتھ پاؤں میں قوت، گھر پر رحمت، گھر والوں پر تیری عنایت۔ الٰہی گناہوں کو بخش دنیا میں سرخرو رکھ۔ عاقبت میں رحم کر۔"

نماز پڑھی، کلام اللہ پڑھا۔ عاما موجود تھی۔ مگر باورچی خانہ میں جا گھسیں کیوں اس خیال سے کہ کھانے میں خرابی اور پکانے میں نقص نہ رہ جائے

وقت سے پہلے تیار اور ضرورت سے قبل موجود، ان کی ہر ادا پہ۔ ان کے ہر کام پہ ان کے ہر خیال پہ ان کی ہر کوشش پہ دنیائے نسواں مرحبا کے نعرے لگا رہی ہے۔ کھانا کھلا چکیں۔ ماں کو بچوں کو۔ نوکروں کو چاکروں کو۔ ابھی پہ بس نہیں، اس مسجد کے موذن کو جس کی اذان کان میں آتی ہے۔ اس رانڈ کو جو دیوار بیچ رہتی ہے ان یتیموں کو جو اس مکان کے سایہ میں سوتے ہیں کھلا کر اور پلا کر۔ دے کر اور دلا کر۔ آپ خود کھانے بیٹھتی ہیں۔ اتفاق سے سالن نہیں بچا۔ چٹنی پسوائی۔ مٹکے میں سے اچار نکالا اور ہتیلی پونچھ کر روٹی کھا پہلے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس کے بعد پانی پیا۔ یہ مسلمان گھروں کی حوریں ہیں۔ ان کی صورت پہ۔ ان کی حالت پہ۔ ان کی زندگی پہ۔ ان کے تمدن پہ زمین کی کائنات آسمان کے فرشتے فخر کر رہے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں یہ روکھی روٹی نہیں ہے یہ وہ سدا بہار پھول ہیں جو ان کی زندگی کو ہمیشہ مہکائیں گے۔

کھانے سے فارغ ہو کر میاں روٹی کمانے گئے اُنھوں نے سینے پرونے کی بقچیاں کھولیں، ان کپڑوں کو غور سے دیکھ لو، اور ان کی کڑھائیوں کو آنکھ سے لگاؤ۔ یہ سلائی اور کڑھت ان کے ساتھ ختم ہو گئی یہ کیریاں اور بوٹیاں اگر دور ترقی میں کبھی نظر بھی آئیں گی تو مغلانی اور سلائی والیوں کے طفیل۔ نماز ظہر پڑھ محلہ کی ان چار پانچ لڑکیوں کو جو غریب و مفلس ہیں سبق دیں گے۔ پہلے کلام اللہ پھر اردو فارسی۔ اس کے بعد لکھنا اور حساب

اب ایک بات اور سمجھ لو۔ ان کے یہ تعلیمی وظیفے خوشی کے ساتھ جاری ہیں۔ نہ اعلان کی ضرورت۔ نہ طلبی کی خواہش کھلاتی ہیں اور پڑھاتی ہیں پہناتی ہیں اور لکھواتی ہیں۔

عصر کا وقت قریب ہے میاں کے آنے کا وقت بھی قریب ہو گیا۔ بچے بھی

بھی مدرسے سے آرہے ہیں کھانے کی تیاری میں مصروف ہوئیں۔

ذرا اس کمرہ کو بھی دیکھ لو۔ جھاڑ دے ولا چندن کر دیا۔ میز کرسیاں تو نہیں ہیں مگر دری پر چاندنی بچھی ہے۔ پلنگ پر چادریں کسی ہوئی ہیں۔ اجلے برتن پاک و صاف انگنائی۔ جہاں صحت کے اعتبار سے بھی غور کر لو۔ تم کو ایک بات خلاف نہ معلوم ہوگی۔

رات ہو گئی۔ عشا کی نماز سے فراغت پا بچوں کو لے کر بچھونے میں لیٹیں کہانیاں سنائیں۔ دنیا کے نشیب و فراز بتائے۔ خدا کی عظمت۔ اسلام کی وقعت اور رسول کی محبت کا دل پر سکہ بٹھا دیا۔

تم نے یہ گھر دیکھ لئے اور گھر والیاں بھی ان کو پھوہڑ اور جاہل کہتے ہو گریبان میں منہ ڈالو۔ اور دیکھو انصاف کیا کہتا ہے یہ خدا کی بہترین مخلوق ہیں جنہوں نے اپنی زندگی میں خلق و محبت کے ایسے دریا بہائے کہ اب تک ان کا فیض جاری ہے۔ ان کے مبارک ہاتھ چمنستان حیات میں وہ پھول کھلا گئے ہیں جو مدتوں خلق اللہ کے دماغ معطر رکھیں گے۔

ادب کے ہاتھ اٹھا کر ان ماؤں کو سلام کرو تعظیم کی آنکھیں جھکا دو اور کہو۔ جنتی بیویوں۔ چراغ اسلام تمہارے دم سے روشن تھا۔ تعلیم نسواں کا جو خاکہ تم پیش کر گئیں۔ جب تک مسلمان اس کو سر آنکھوں پر نہ رکھیں گے ترقی نہیں کر سکتے

عصمت ۱۹۱۸ء

جنتی بیوی کا ایک دن

بلبل قلم چمنستان تاریخ میں چہکتا ہوا جب اس شاداب قطعہ میں پہنچتا ہے جہاں خواتین اسلام گلہائے رنگین کے تختے دونوں ہاتھوں میں لئے بساط اسلام کو معطر کر رہی ہیں تو دنگ رہ جاتا ہے۔ اس کی زمزمہ پردازیاں ساکت ہوتی ہیں۔ اور خاموشی کا قفل نواسنجیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ یہ قابل قدر ہستیاں اپنے زریں اعمال اور بیش بہا اقوال سے اسی فانی دنیا کی انصاف پسند نگاہوں میں اتنا وقار پیدا کر چکی ہیں کہ حقیقت شناس مردوں کی سربلند گردنیں ان کی شرمگیں نگاہوں کے سامنے خم ہیں۔ وہ گھر کی بااختیار ملکہ ہیں۔ بچوں کی بے مثل اتالیق، ان کے قیاس درست۔ ان کی رائے صائب ان کے عقائد پکے ان کا مذہب صحیح۔

دور حاضرہ کا متجسس سیاح جب آبادی سے سیر ہو کر ویرانہ کا رخ کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ وہی طوطی خوش الحان جو شہر کی چہل پہل میں باآواز بلند چہک رہا تھا اور جس کی سریلی تانیں دلوں کو مسخر کر رہی تھیں، اس سنسان منزل میں خاموش ہے تو حیرت کا ابر سیاہ اس کے دل و دماغ پر چھا جاتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ درختوں کے پتے۔ زمین کی گھاس، اور ہوا کے ذرے یاد رفتگاں میں رنج کے آنسو بہا رہے ہیں۔ عالم اسلام کی جگہ دوز آہیں بلند ہو کر فلک نیلگوں

تک پہنچتی ہیں۔ اور دھواں دھار گھٹا بن کر مٹی کے ڈھیروں پر برستی ہیں
تعجب کی زنجیریں اس کا پاؤں پکڑ لیتی ہیں۔ اور وہ انگشت بدنداں ہر
سمت دیکھتا ہے کہ دفعتاً خوش الحان کا نالہ اس کے کان میں پہنچتا ہے۔
وہ سنتا ہے کہ

"کیا تھا کیا ہو گیا"

چلتا ہے اور سوچتا ہے، بڑھتا ہے اور رکتا ہے۔ پیہم نالے اس کے حواس
باختہ کر دیتے ہیں کہ ایک صدا اس سناٹے میں گونجتی ہے۔

نووارد سیاح جس خاک کو روند رہا ہے۔ یہ وہ مبارک ہڈیاں ہیں جو
اسلام کے چراغ روشن کر گئیں۔ یہ مسلم خواتین کے اس طبقہ کی آرامگاہ ہے
جس کے نام پر خلوص قربان ہوا۔ جس کے قدموں پر ایثار نے سجدے کئے انکی
زندگی نے وہ کام کئے ہیں کہ دیکھنے والی آنکھیں ان کی جدائی پر خون کے آنسو
گرائیں گی۔ تڑپیں گی اور روئیں گی چیخیں گی اور بلبلائیں گی۔ مگر چشم بینا انکا
نعم البدل نہ دیکھے گی۔

جانتے ہو یہ مٹی کے ڈھیر کا ٹوٹا ہوا کتبہ جس پر املی کی پتیاں ٹکریں مار رہی
کس کا مرثیہ پڑھ رہا ہے۔ تم نے فاختہ کی کوکو سنی۔ یہ اس جنتی بیوی کے واقعات
دوہرا رہی ہے۔ جس کے سرہانے بیٹھی گریہ کناں ہے۔

سنو اور دیکھو، سمجھو اور پڑھو۔ یہ اس کتاب زندگی کا ایک ورق ہے اسکے
روزنامچہ کا ایک صفحہ اور عمر ناپائدار کا ایک دن۔

شب سرما کا تسلط ہر سمت پوری طرح جما ہوا تھا۔ مرغ اور موذن دونوں
بے خبر تھے کہ یہ بیگم رسول عربی کی نبوت کا اقرار کرتی ہوئی بستر استراحت سے
اٹھی اس کا دل و دماغ دونوں توحید و رسالت کی قوت محبت سے ہراساں

اور لبریز تھے پانی گرم کیا۔ وضو کیا۔ کہ ہوا نے ایک طرف سے صدائے توحید ورسالت اس کے کان میں پہنچائی۔ موجودہ دنیا اگر وہ سماں دیکھنا چاہتی ہے تو ان بیویوں کو قبر سے اٹھا لائے۔ وقت یہ ہے کہ زلف شب کا جال دور تک پھیلا ہوا ہے اور حالت یہ کہ ایک مسلمان عورت جو ہر لحہ یقین موت سے وابستہ ہے۔ خدائے برتر کے حضور میں حاضر ہونے کی تیاریاں کر رہی ہے۔ یہ وہ ساعت ہے کہ عظمت باری تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے خیال کا گذر اس کے قلب میں نہیں۔ وہ ہوا سے بلند ہونے والی آواز کے یہ الفاظ سنتی ہے " نماز نیند سے بہتر ہے۔ ذرا اس کا یقین اس کا ایمان۔ اس کا اسلام دیکھو۔ اس کا دل کانپتا ہے ہاتھ پاؤں تھرّاتے ہیں۔ اس کی آنکھیں غلبہ خوف سے سجدے کے واسطے اوپر اٹھتی ہے وہ دیکھتی ہے کہ فضا آسمانی کا ہر ذرہ شہنشاہ حقیقی کا گیت گا رہا ہے۔ تاروں کی سبھا چاند کی روشنی، رات کا اندھیرا سب دم توڑ رہے ہیں۔ اس کی آنکھیں اس کا سر اعتراف حقیقت پر جھک جاتے ہیں۔ اور وہ بآواز بلند کہتی ہوئی شوہر کو جگاتی ہے الصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ۔

حسن عقیدت کے گلہائے رنگیں، سے آراستہ و پیراستہ شوہر کلمہ توحید پڑھتا ہوا بستر استراحت سے اٹھا تو ابھی صدائے حق فضائے آسمانی میں گونج رہی تھی زبان خاموش رہی۔ مگر دولت قدر سے لبریز آنکھیں، شیدائے مذہب بیوی کے استقبال کو جھکیں۔ دل ہی دل میں جزاک اللہ اور مرحبا کہتا ہوا آگے بڑھا تو ضرورت کی تمام چیزیں موجود تھیں۔ صابن اور برش نہ تھا مگر منجن اور مسواک تیار تھی شوہر کو مسجد میں بھیج جنتی بیوی یاد خدا میں مصروف ہوئی۔

ذرا احساس فرائض پر نظر ڈالنا۔ اس کے دونوں ہاتھ کیسے سدا بہار پھولوں سے مزین ہیں۔ اگر ایک ہاتھ کی مٹھی دنیا کی فانی کلیوں سے لبریز ہے تو دوسرے

ہاتھ میں دین کے وہ خوشبودار گجرے سود ہے ہیں جن کی ہر پتی بقائے دوام سے مالامال ہے۔

طلوع آفتاب سے قبل کہ بچے بیدار اور شوہر وظائف سے فارغ ہو ناشتہ تیار ہے لیکن چائے اور بسکٹ نہیں۔ توس اور مکھن نہیں۔ مونگ کی کھچڑی اور روغنی ٹکیاں۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ یہ عقیدہ اچھا تھا یا برا کہ اس ناشتہ میں ایک حصہ اس کا بھی تھا جس نے یہ نعمت عطا فرمائی اور بچوں کے ساتھ کبھی محلہ کی یتیم بچی شریک ہوئی۔ اور کبھی مسجد کا نابینا موذن۔

عالم اسلام آج ان نسوانی ہستیوں سے محروم ہے بدتر تھیں یا بہتر۔ مگر ایسی تھیں کہ ان کی یاد آج تک زندہ دلوں کو تڑپا رہی ہے۔ ان کا تذکرہ اب تک زبانوں پر موجود ہے۔ اور دیکھنے والی آنکھیں عالم خیال میں اس وقت تک ان کی فانی صورتوں کی پرستش کر رہی ہیں

لو آنکھیں کھولو اور مساوات اسلامی کا سبق ان سے سیکھو۔ تم نے قرون اولیٰ کے واقعات پڑھے اور سنے۔ یہ دیکھو اور روڈ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد مگر کیسی فراغت، سب کو کھلا کر خود کھانے بیٹھی ہے۔ کہ محلہ کی ایک عورت کلبٹا برقعہ زدہ حال آ بیٹھی ہے اپنی مصیبت سنانی شروع کی، یہ غیر نہیں جان پہچان ہے۔ بیگم اس کے حال سے واقف اور مصیبت سے آشنا ہے اس کے آتے ہی ہمدردی کی آنکھوں سے اس کا استقبال کیا۔ اور محبت کے ہاتھ اس کے لینے کو آگے بڑھائے اصرار کیا۔ منت کی خوشامد کی۔ دیکھو دیکھو کیا ہو رہا ہے۔ بیگم اور فقیرنی دونوں ایک دستر خوان پر کھانا کھا رہے ہیں۔

کہو! کیا دیکھا۔ کیا آئندہ بھی یہ منظر دیکھو گے۔

ماما موجود تھی۔ مگر اس لئے نہیں کہ بیگم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتی وقت مقررہ سے پہلے شوہر اور بچوں کو کھانا دیا کہ ماما کی سستی انکی ذمہ داری پہ حرف نہ آئے۔ دس بجے سے بچیوں کو پڑھانے بیٹھی۔ سبق کلام اللہ کا تھا مجال نہ تھی کہ کوئی بچی زیر زبر تک کی غلطی کر جائے۔ ادھر توپ چلی بارہ بجے، ادھر اس نے کہا۔ بس زوال کا وقت ہے قرآن شریف رکھ دو اور سوئی دھاگہ لو۔

تمدن اسلام سے یہ ایسا سماں درہم برہم ہوگیا کہ موجودہ معاشرت عمر بھر ہر ڈھنگی اور یہ رنگ نصیب نہ ہوگا۔ انہوں نے بساط زندگی پر جو افشاں کی ہے وہ ایسی پائدار ہے کہ تاریخ اس کو دیکھ کر عش عش کر رہی ہے بلبل قلم چہکتا ہو جب اس جگہ پہنچتا ہے کہ عالم اسلام پہ حکومت کرنے والیاں قبروں میں آرام کر رہی ہیں تو اسکا نالہ قبرستان کو سر پہ اٹھا لیتا ہے۔ وہ روتا ہے اور کہتا ہے۔

"ہزاروں من مٹی کے نیچے سونے والی بیبیو! تمہاری جہالت پر آج کی تعلیم قربان مسجدیں تمہارے دم سے اور مدرسے تمہارے کرم سے آباد تھے آج خانقاہیں سنسان اور مدرسے ویران ہیں! تم ہم کو دکھا گئیں کہ مسلمان عورت کی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ خدا تم پر اپنی رحمت نازل کرے۔

محترم ماؤں دعا کرو کہ قوم میں پھر تم جیسی بیبیاں پیدا ہوں جن کی پاک ہستیاں عالم اسلام کو جگمگا دیں؟

عصمت ۱۹۲۲ء

عورتوں کی تعلیم اور جہالت

اکتوبر کے رسالہ عصمت میں محترمہ سلطان بیگم صاحبہ نے تعلیم نسواں کے متعلق مجھ سے چند سوالات کئے تھے جس کا جواب میں دے چکا ہوں۔ اب عزیزہ حامدہ بیگم صاحبہ نے تہذیب نسواں میں اسی قسم کا ایک مضمون بعنوان تعلیم نسواں لکھا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ آج سے نصف صدی بیشتر کی خواتین۔ خانہ داری کے اکثر معاملات سے باخبر تھیں۔ اور جو ہنر آج تعلیم کے ذریعہ سے عورتوں میں پیدا کئے جا رہے ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر پچھلی بیویوں میں موجود تھے مگر باوجود اس کے وہ جاہل کہی جاتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس مضمون میں حامدہ بیگم صاحبہ نے جواب کے واسطے مجھے بھی مخاطب کیا ہے اور تہذیب میں کسی صاحب نے اس کا جواب بھی لکھا ہے۔ میں حامدہ بیگم صاحبہ کے خیالات سے ایک بڑی حد تک متفق ہوں اور نامہ نگار تہذیب کے خیالات سے باوجود کوشش سے متفق نہ ہو سکا۔ افسوس ہے کہ میرے سامنے اس وقت تہذیب کا وہ پرچہ نہیں ہے مگر میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہوں۔

قدرت نے یہ نظام قائم کیا ہے کہ ہر موسم میں زمین کی پیداوار آب وہوا کی مناسبت سے ہوتی ہے۔ تربوز ٹھیٹ گرمی میں ہوتا ہے جب وقت لُو کے جھکڑ

جلتے ہیں اور انسان پسینہ پسینہ ہوتا ہے۔ پیاس کے مارے حلق میں کانٹے پڑتے ہیں۔ اس وقت تربوز کا ایک قتلہ یا شربت کا ایک کٹورا عجیب تسکین و فرحت بخشتا ہے۔ لیکن یہی تربوز اگر جاڑوں میں ہوتا تو بجائے ایک کٹورے کے آدھا کٹورہ بھی حلق سے نہ اترنے پاتا اور پینے والا نمونیہ میں مبتلا ہو جاتا۔

زمین کی تمام پیداوار کا قریب یہی حال ہے اور یہ نظام عالم ہے اسی طرح زمانہ کی رفتار انسان کو اپنے سانچے میں ڈھال کر ہموار کر لیتی ہے حامدہ بیگم صاحبہ نے جن بیویوں کو پیش کیا ہے اس وقت کا مطالبہ وہی تھا۔ مگر آج وقت کا مطالبہ کچھ اور ہے۔ اس لئے جن لڑکیوں کی ضرورت موجودہ زمانے کو ہے اسی قسم کی لڑکیاں پیدا ہونی چاہئیں۔

نامہ نگار تہذیب نے اگلی بیویوں کے متعلق رائے قائم کرنے میں بہت عجلت سے کام لیا ہے۔ یہ خیال کہ وہ ختنہ وغیرہ کے مراسم میں روپیہ زیادہ صرف کرتی تھیں حقیقت کے موافق نہیں وہ جتنی چادر دیکھتی تھیں۔ اتنے ہی پاؤں پھیلاتی تھیں۔ اور آج سے نصف صدی بیشتر کا کوئی مسلمان گھرانا ایسا ہوتا تھا جہاں گھر کی بڑی بوڑھی کے پاس بے وقت کے واسطے کچھ پس انداز نہ ہو مگر آج مسلمانوں کی حالت بالکل اس کے برخلاف ہے اگر نامہ نگار تہذیب کی یہ رائے صحیح تسلیم کر لی جائے کہ مرنے والی بیویاں مراسم میں فضول خرچی کرتی تھیں تو اس بیوی کے مقابلہ میں جو محض اپنے ذاتی اخراجات کا بوجھ ڈالکر شوہر کو زیر بار کر رہی ہے۔ وہ بیوی جو پانسو کی مالک ہے یقیناً یہ حق رکھتی ہے کہ ۲۵۰ روپئے بچے کی شادی پر اٹھا کر اپنا دل خوش کر لے اور ۲۵۰ محفوظ رکھے ان واقعات کا ثبوت سب سے بہتر یوں ہوگا کہ آج سے پچاس سال قبل کے حالات کا مقابلہ موجودہ حالات سے اس طرح کیا جائے کہ اس وقت مسلمان کس قدر

مقروض ہوتے تھے۔ اور آج مسلمان کس قدر دستاویزیں لکھ رہے ہیں۔
افسوس ہے کہ میں نامہ نگار تہذیب کے اس خیال سے بھی متفق نہیں ہوں کہ پہلی بیویاں توہمات اور تعویذ گنڈوں میں زیادہ مبتلا تھیں۔ جس طرح آجکی تعلیم یافتہ ان باتوں سے دور رہتی ہیں۔ اس طرح اس وقت کی پڑھی لکھی بھی ان باتوں کو پسند نہ کرتی تھیں۔ جاہل اس وقت بھی یہی کرتی تھیں اور اب بھی یہی کرتی ہیں۔
نامناسب نہ ہوگا اگر میں اس موقعہ پر پیری مریدی کی رفتار سابق کا مقابلہ دور حاضرہ سے کروں۔ اور یہ سوال کروں کہ پیروں کا وہ گروہ زیادہ مقبول تھا یا یہ یعنی پچاس برس پہلے کے پیر زیادہ خوش حال تھے یا آج کے۔ اس کے بعد دوسرا سوال ہوگا کہ اگر آج کے پیر زیادہ خوش حال ہیں تو ان کی آمدنی کے ذرائع مرد زیادہ ہیں یا عورتیں؟ میں یقین کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا۔ مگر میرا خیال ہی کہ عورتیں اس میں کم نہ ہوں گی۔
تین چار سال ہوئے ایک لڑکی انٹرنس کا امتحان دینے دہلی آئی۔ اور دفتر عصمت ہی میں ٹھیری۔ اس نے یہاں پہنچکر پہلا کام یہ کیا کہ اپنے پیر کا تعویذ لیا۔ پھر امتحان میں شریک ہوئی۔
حامدہ بیگم صاحبہ نے جو یہ بحث چھیڑی ہے وہ بہت طویل ہے۔ اور میں مرنے والی بیویوں کو اکثر اعتبار سے بہت اچھا سمجھتا ہوں اور مجھے دیکھکر دلی صدمہ ہوتا ہے کہ موجودہ تعلیم یافتہ لڑکیوں نے اپنی جہالت کے مصارف کا مستقل بار شوہر کی آمدنی پر ڈال رکھا ہے اور وہ صرف اس لئے کہ ہل کر پانی بھی نہیں پیتیں اور ہر ضرورت کے واسطے ملازم رکھنا پڑتا ہے۔
میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے کہ مرنے والی بیویاں باوجود ماما اور باورچی

ہونے کے گھر کا بہت سا کام خود کرتی تھیں۔ سالن ہر حال میں خود ہی پکاتی تھیں محنت سے جی نہ چراتی تھیں۔ اور یہی ان کی ورزش تھی۔ مہمان کے سامنے اپنی ذمہ داری اور شوہر کی عزت کو ہمیشہ نظر رکھتی تھیں اور شوہر کو کھانے کی میز پر یہ کہنا پڑتا تھا کہ

"افسوس باورچی کی غلطی سے شامی کبابوں میں نمک زیادہ ہو گیا۔"

عصمت سنہ ۱۹۲۶ء

قطب صاحب کے جواہر ریزے

دہلی سے گیارہ میل کے فاصلے پر قصبہ مہرولی ہے جس کو قطب صاحب اور خواجہ صاحب بھی اس لئے کہتے ہیں کہ وہاں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے قطب مینار یعنی قطب صاحب کی لاٹھ اسی جگہ واقع ہے یہاں کا چپہ چپہ تاریخ کا دفتر ہے۔ اور قدم قدم پر جلیل القدر بادشاہوں اور بزرگوں کی قبریں اور مزارات ہیں۔ ایک قطب مینار ہی نہیں بیسیوں پرانے زمانہ کی عمارتیں اپنے مالکوں اور مکینوں کی یاد تازہ کر رہی ہیں۔ اولیاء مسجد، شمسی تالاب شیخ کا مقبرہ الغرض یہ وہ جگہ ہے جہاں میلوں اور کوسوں خزانے دفن ہیں۔ جن کی نظیر سرزمین ہند پر مشکل سے ملے گی۔

چپہ چپہ پر ہیں یاں گوہر یکتا تہ خاک　　دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز

یوں تو دلی دروازے سے باہر نکلتے ہی کھنڈر شروع ہو جاتے ہیں۔ اور نظر ان کچی پکی قبروں ٹوٹے پھوٹے مزاروں پر پڑتی ہے جن کے لیٹنے والے علم و فضل اور زہد و اتقا کے ڈنکے بجا گئے۔ مہندیوں میں مولانا شاہ عبد العزیز کا وہ خاندان آرام کر رہا ہے جس نے متواتر چھ نسلوں تک ایسے جید عالم پیدا کئے کہ دنیا دنگ رہ گئی۔ سلطان جی میں حضرت نظام الدین اولیاء حضرت امیر خسرو جیسی باکمال ہستیاں مصروف خواب ہیں ادھر ہمایوں ادھر صفدر جنگ المختصر دور تک یہ سلسلہ اسی طرح چلا گیا ہے لیکن مہرولی ہی ہے

جہاں فقیر اور بادشاہ دونوں خاک کی سیجوں میں دفن ہیں۔

کل ۱۴ مئی کو میں قطب میں تھا دوپہر کے وقت فاختہ کی کو کو تہ خانہ سے جنگل میں لائی۔ دھوپ کی چادر دور تک پھیلی ہوئی تھی اور جہاں تک نگاہ جاتی تھی قبروں کا سلسلہ ختم نہ ہوتا تھا۔ ہوا گرم تھی اور ببول کے درخت مٹنے والوں کی وداع پر کہرام مچا رہے تھے۔ بگولے شہر خموشاں کی خاک چاروں طرف اڑاتے پھرتے تھے اور فاختہ کی صدا ان ذرات کے گلے میں بانہیں ڈال رہی تھی۔ دوپہر کا سناٹا اس خاموش آبادی میں طاری تھا مگر مردوں کی اس سنسان مجلس میں کائنات کی اکثر اشیاء موسیقی کا کمال دکھا رہی تھیں۔ ہوا کے ہاتھ میں ساز تھا۔ فاختہ غزل خواں تھی۔ اور پتے رقص کر رہے تھے۔ آفتاب کی تیز شعاعوں نے مجھے دھکے دے کر نکالا۔ اور میں شیخ کے مقبرہ پر چلا گیا۔

شیخ عبد الحق محدث دہلوی کے احاطہ میں جو مفتی والوں کا قبرستان مشہور ہے داخل ہوا تو کتبوں میں وہ نام نظر آئے جو میری آنکھوں کے سامنے زمین کا پیوند ہو رہے ہیں۔ پیاری بہن صغریٰ بی بیگم کی قبر دیکھی جو میری پھوپی زاد بہن اور شمس العلماء مولوی نذیر احمد مرحوم کی صاحبزادی تھیں۔ قبر دیکھتے ہی ان کی صورت آنکھوں کے سامنے آگئی اور ساتھ ہی انکی عادات خصائل ان کی پاک زندگی۔ ان کا اسلام اور ان کے کارنامے۔ معاً ذہن اس مضمون کی طرف منتقل ہوا۔ جو پچھلے دنوں میں حامدہ بیگم نے تعلیم نسواں کے سلسلے میں اگلی اور موجودہ تعلیم کے متعلق لکھا تھا اور جس کے جواب میں کسی صاحب نے مرنے والوں کو جاہل اور موجودہ لڑکیوں کو تعلیم یافتہ فرمایا تھا۔ یہ بحث گو اس لئے زیادہ مفید نہیں کہ دورِ حاضرہ کی لڑکیوں کے ذہن میں انکے ناعاقبت اندیش خیر خواہوں نے یہ بٹھا دیا ہے کہ موجودہ تعلیم ہر اعتبار سے انکے واسطے مفید ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مذہب

مسلمان لڑکیوں سے کوسوں دور ہوگیا۔ لیکن جی چاہتا ہے کہ علمی بہنوں کو ان ہنے والوں کی جھلک دکھادوں۔ اور شیدائیان تعلیم جدید سے دریافت کروں کہ اسلام کی کسوٹی پہ یہ جوہر پارس ہیں یا پتھر اور کیا تعلیم بھی کوئی ایسا نمونہ پیش کرسکتی ہے۔

صغریٰ بیگم۔ مرحوم کا زمانہ زیادہ دنوں کا نہیں ابھی کا ہے۔ انکے دیکھنے والے بیسیوں مرد اور عورتیں زندہ ہیں۔ ان کی رحلت کو سات برس ہوئے ہونگے ان کا چھوٹا بچہ اشرف ایم۔ بی۔ سی۔ ایچ۔ بی حیدرآباد میں ہے۔

ان کا اردو کا خط اتنا پاکیزہ تھا کہ آجکل کی تعلیمیافتہ لڑکیوں میں مشکل سے شاید دو فیصدی کا ایسا ہو۔ وہ انگریزی نہ جانتی تھیں۔ لیکن فارسی بہت اچھی تھی گلستان بوستان سکندرنامہ شاہنامہ حفظ تھا۔ کلام اللہ کی حافظہ تھیں مگر مشکل سے ممکن تھا کہ ان کے سامنے کوئی غلط قرآن شریف پڑھے اور وہ نہ ٹوکیں نماز روزہ کی سختی سے پابند تھیں۔ رمضان بھر مساجد کی افطاریوں کے علاوہ نہ معلوم کتنی عورتیں ان ہی کے ہاں روزہ کھولتی اور کھانا کھاتی تھیں جو چیز آج کانفرنسوں اور انجمنوں اور ریزولیشنوں سے حاصل نہیں ہوتی وہ انکے دم سے اسطرح پوری ہوتی تھی کہ غریب عزیزوں کی مقررہ تنخواہوں کے علاوہ محلہ میں جس شخص کو قرض کی ضرورت ہوتی تھی وہ گھروی گانٹھے سے محفوظ تھا۔ چیز بھی اور روپیہ ان سے لے گیا۔ وہ بڑی جائداد کی مالک تھیں۔ مگر جب کبھی مرمت کی ضرورت ہوتی، جس قدر چونا اینٹ مٹی آتا پہلے اس سے کسی مسجد کی مرمت ہوتی۔ اس کے بعد جائداد کی شہر کی ایسی مسجدیں کم ہونگی۔ جن کے مؤذن اور پیش امام ان کو دعائیں نہ دیتے ہوں۔

مولوی عبدالرب صاحب مرحوم جو انکے حقیقی چچا تھے جب تک سہارنپور کی جامع مسجد بنوارہے تھے وہ حیدرآباد سے دہلی آئی ہوئی تھیں۔ نقد روپیہ کے

علاوہ انہوں نے اپنا تمام زیور جو کئی ہزار کی مالیت تھا مسجد میں دے دیا اس زیور میں سب سے بڑی بات یہ تھی کہ یہ وہ زیور تھا جو ان کو میکے سے جہیز میں ملا تھا۔

یہ چند باتیں ہیں اور یہ وہ باتیں ہیں کہ کسی ایک عورت میں نہیں اس وقت کی اکثر عورتوں میں موجود تھیں۔ اور وجہ صرف یہ تھی کہ تعلیم مذہبی احساس پیدا کرتی تھی۔ آج میں جس چیز کو رو رہا ہوں وہ یہی ہے۔ حامیان تعلیم موجودہ فرماتے ہیں کہ اس نصاب میں جو آج کل پڑھایا جا رہا ہے جو خرابی ہے وہ بتائیے میں نہیں جانتا اس کا کیا جواب دوں۔ مگر جو سوال اوپر کیا ہے اس کو پھر دوہراتا ہوں کہ

کیا مدرسوں کی مروجہ تعلیم مذہب کا یہ احساس پیدا کر سکتی ہے؟

عصمت ۱۹۲۶ء

اگلی اور اب کی بیویاں

مسلمان تعلیم نسواں کے مخالف نہیں۔ حدیث قرآن ان کا ایمان اور ارشاد نبوی ان کی جان۔ مگر نہ معلوم زمانہ کا اثر ہے یا تقاضائے تمدن کہ گو پڑھی لکھی بیویوں میں مہذب لڑکیوں اور تعلیم یافتہ ماؤں کی کمی نہیں۔ مگر وہ جوہر جو اگلی بیویوں میں سے روز بروز مٹتے جا رہے ہیں اور مقابلۃً اس کا نتیجہ یہ پہنچتا ہے کہ یا تو وہ جوہر ہی نہیں۔ خبط تھے یا موجودہ تمدن ناقص اور غیر مکمل ہے۔

اس بحث پر کچھ لکھنے سے پہلے ہم ایک ایسی بیوی کی روزانہ زندگی پر نظر ڈالتے ہیں۔ جو اس زمانے میں اپنی زندگی بسر کر رہی ہے۔

اس کی عمر تقریباً بیس بائیس سال کی ہوگی۔ تین بچوں کی ماں ہے۔ شوہر ڈھائی سو روپیہ کا منصف اور ایک معزز آدمی ہے گھر میں دو دو مامائیں۔ دروازے پر ایک باورچی ایک نوکر۔ گھوڑا گاڑی۔ سائیس۔ کوٹھی کے احاطے میں باغیچہ رنگ برنگ کے پھول۔ اعلیٰ درجہ کا فرش، دریاں۔ قالین۔ میز کرسی۔ سونے کا۔ بیٹھنے کا۔ ملنے کا۔ کمرہ الگ۔ اور ہر ضرورت کا سامان جدا۔ یہ مہذب بیوی جاڑوں کے موسم میں ساڑھے آٹھ بجے سو کر اٹھیں۔ ماما دوا کی شیشی لائی۔ اٹھتے ہی دوا پی۔ اسکے بعد ہاتھ منہ دھویا۔ غسل خانہ میں گئیں۔ کنگھی چوٹی کی۔ کپڑے بدلے آرام کرسی پر آ کر بیٹھیں، چاء پی اور ڈاک دیکھنے لگیں۔ گیارہ بجے ماما نے اطلاع دی "کھانا تیار ہے" حکم دیا "

لے آؤ۔" باورچی نے کھانا نکالا، مامائیں کشتیاں لیکر آئیں۔ اور کھانا کھایا گیا کھانے سے فراغت پا منصف صاحب کچہری گئے۔ بیوی قیلولہ کو لیٹیں۔ سینے والی کپڑے لے کر آئی۔ کوئی پسند کیا کوئی ناپسند۔ اور آرام خاص میں پہنچیں۔ برآمدہ میں آئیں تو ایک جوان عورت اور دو بچے منتظر تھے۔ بیوی کی صورت دیکھتے ہی عورت اٹھی۔ جھک کر سلام کیا اور گڑگڑا کر کہا۔

"بیگم میں مصیبت ماری ہوں۔ یہ دو یتیم بچے ہیں۔ ہم سب کل سے بھوکے ہیں اپنے بچوں کا صدقہ۔ ہمارا پیٹ بھر دیجئے۔"

بیوی۔ "تمھارے ساتھ سلوک کرنا سخت گناہ ہے۔ تم کو یہاں آنے کی اجازت کس نے دی۔ بلاؤ دربان کو۔ تم لوگوں نے بھیک مانگنے پر کمر باندھ لی۔ کیوں نہیں محنت مزدوری کرتے۔ یہ چھوٹا بچہ تو خیر دودھ پیتا ہے۔ مگر بڑا پانچ سال سے کم نہیں اسکو نوکر رکھوا دو تم خود نوکری کرو۔"

عورت۔ "بیگم میں نوکری کے قابل ہوتی تو بھیک نہ مانگتی۔ میں دق میں گرفتار ہوں۔ مجھ کو اس وقت بھی بخار چڑھا ہوا ہے۔ یہ بچہ تین سال کا ہے۔ نوکری کے لائق نہیں۔ آپ اگر ہمارے ساتھ کچھ سلوک کریں تو اچھا ہے ورنہ ہم چلے جاتے ہیں۔"

بیوی۔ "بھاگ جاؤ۔ آیندہ کبھی نہ آؤ۔ تمہاری بیماری کا ذمہ دار خدا ہے۔ ہم نہیں ہیں۔ تمہارا ہم پر کیا حق ہے؟"

عورت۔ "نہیں بیگم کچھ حق نہیں ہے۔"

عورت نے اپنے بچوں کا ہاتھ پکڑا اور چلی گئی۔

چار بجے ہوں گے منصف صاحب کچہری سے آئے چاء کا دور شروع ہوا اور میاں بیوی کی باتیں اس طرح ہوئیں۔

میاں۔ آج تبادلہ کا حکم آگیا۔ اب مجھے زیادہ سے زیادہ پرسوں یہاں سے چلے جانا

چاہیئے۔ مگر یہاں کا حساب صاف کرنا ضروری ہے ایک سو چھتر روپیہ چھ آنے تصویروں کے دینے ہیں۔ اور تین سو چالیس فرنیچر والے کے تیراسی روپے کے قریب درزی کے ہوں گے۔ اور سات سو سے اوپر بزاز کے۔ اب بتاؤ میں کیا کروں جس طرح ہو یہ روپیہ ادا کرو۔ ورنہ تمام عزت آبرو خاک میں مل جائیگی ؟

بیوی:- میں کیا بتا سکتی ہوں۔ کوئی زیور بھی نہیں کہ وہی الگ کر دیا جائے میں آج ذرا اور سے چھوٹی ہوں تو تم نے یہ ذکر شروع کر کے مجھے اور پریشان کر دیا پانچ بج چکے تھے کہ زنانہ یتیم خانہ کے سکریٹری کا آدمی آیا اور کہا "جلسہ میں آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ بیوی نے کہا ہے کہ اگر آپ نہ آئیں تو جلسہ درہم برہم ہو جائے گا۔ اور ان یتیموں کی جڑاول یوں ہی رہ جائے گی"

بیوی نے باتیں سنیں پرچہ پڑھا اور اس سے کہدیا "میرا سلام دو اور کہہ دو میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔ ہمارا تبادلہ ہو گیا۔ ہم اپنا چندہ وہاں کی انجمن میں دیں گے شام ہو گئی، اندر سے ماما نے لیمپ اور لالٹینیں باہر پہنچائیں۔ اور باہر سے مشعلچی نے تیل بھر جلا اندر بھیجیں۔ میاں موجود نہ تھے بیوی کچھ دیر تک ٹہلتی رہیں اور سوچتی رہیں۔ عشا کے وقت باوجود فکر کے تھوڑا سا باجہ بجا اور دس بجے کے قریب اخبار پڑھتے پڑھتے سو گئیں۔

ان بیوی کو یہیں چھوڑیئے اور نگاہ کو چند منٹ کے واسطے آج سے تیس چالیس برس پہلے کی بوڑیوں پہ دوڑائیے۔ وہی شہر شاہجہان آباد اور صبح کا سہانہ وقت۔ ایک مختصر سا مکان ہے۔ جہاں میز کرسی قالین کچھ نہیں۔ ٹاٹ پہ سفید چاندنی بچھی ہوئی ہے مگر اس طرح سے کہ سلوٹ آلود نہیں۔ گھر والی ایک ادھیڑ عمر کی عورت ہیں صبح چار بجے اٹھیں۔ ماما کوئی نہیں ہے۔ مگر دور کے رشتہ کی ایک بڑھیا کام کاج کو موجود ہے۔ اس کو نہ جگایا۔ آگ سلگائی۔ پانی گرم کیا۔ وضو سے فارغ ہو بیاں

کے واسطے، گرم پانی رکھ ان کو جگا کر نماز میں مصروف ہوئیں۔ پڑھ چکیں تو بچوں کو اٹھایا۔ وہ نماز میں مصروف ہوئے آپ کلام اللہ لے کر بیٹھیں۔ آفتاب نکلنے سے پہلے نماز اور تلاوت سے فرصت پا کھانے کی تیاری شروع کی، سالن رات کا تیار تھا۔ آٹھ بجے سے پہلے پہلے آدھی سے زیادہ روٹی پکالی۔ میاں کھانے بیٹھے گرم گرم روٹی ان کو کھلائی۔ بچوں کو دی۔ میاں پچاس روپیہ کے نہر میں سررشتہ دار تھے۔ وہ کھانا کھا کر اٹھے۔ لپک کر پانوں کی ڈبیا بنائی۔ وہ کچہری گئے تو آپ کھانے بیٹھیں۔ دو ہی نوالے کھائے ہوں گے کہ پڑوسن کی ایک لڑکی نے آ کر کہا۔

"خالہ اماں کہہ رہی ہیں۔ نخار ور ہا ہے میرا جی اچھا نہیں ایک روٹی اور ذرا سا سالن دیدو۔

برتن میں سالن نکالا۔ دستر خوان سے روٹیاں لیں اور اس کو دیں۔ کھانے سے فارغ ہوئی تھیں کہ ایک برقع والی آنکلی۔ چپکے چپکے کچھ باتیں کیں اور خاموش بیٹھ گئی۔ کچھ دیر سکوت رہا۔ پھر گھر والی نے آہستہ سے کہا۔

شہزادہ روتی کیوں ہے۔ اللہ سب کی مشکلیں آسان کر دیتا ہے۔ محلہ کی بیٹی اپنی بیٹی ہوتی ہے۔ سات پانچ کی لاٹھی ایک جنے کا بوجھ۔ برتن تو میرے پاس کوئی نہیں۔ ہاں دو جوڑے موجود ہیں۔ ٹھیر جا شاید خالہ جان کے برتن تھے تو سہی۔"

ڈبیا جلا کر اندر کوٹھری میں گئیں۔ دو بجے تک ڈھونڈ ڈھانڈ سات برتن جمع کئے۔ دو جوڑے نکالے اور دس روپیہ کی پڑیا باندھ کر اس کی نذر کی۔ نماز کا سلام پھیرا تھا کہ دھوبن کی لڑکی روتی ہوئی آئی۔

"اری محمدی کیا ہوا۔ اماں کیسی ہے؟"

محمدی۔ "بیوی وہ تو اللہ کے ہاں گئیں۔"

بیوی: "انا للہ وانا الیہ راجعون پھر اب گھر میں کون کون ہے۔"

محمدی: "یہ کوئی نہیں۔ میں ہی ہوں۔ خبر نہیں کیا کیا کرتے ہیں۔"

بیوی۔ ہائے کیا جنتی بیوی تھی۔ تیس برس میں کبھی ایک جھگڑا تک ادھر سے ادھر نہ کیا۔ ٹھیر جا بیٹی میں چلتی ہوں۔ جا ڈولی لے آ۔"

بڑے لڑکے کو ساتھ لے وہاں گئیں۔ اپنے ہاتھ سے نہلایا دھلایا اپنے پاس سے گور و کفن کیا اور مغرب سے پہلے اپنے گھر چلی آئیں۔ عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر میاں بیوی میں یہ باتیں ہوئیں۔

میاں۔ "شادی کی تاریخ تو اب قریب آ گئی۔ یہ سات سو روپیہ موجود ہیں۔ اسی میں سب کام کرنے ہوں گے۔

بیوی۔ "بس کرو" تم اپنا جی نہ کڑھاؤ۔ جس دن صالحہ پیدا ہوئی تھی اسی دن سے آج کا دن میرے سامنے تھا۔ جو کچھ ہو سکا جوڑ جاڑ کر رکھا ہے۔ کپڑے کا تو زیادہ فکر نہیں۔ چودہ جوڑے تیار ہیں۔ فقط ایک پرپصالحہ نہیں ہے اس میں سے پانسو کا زیور کر دو۔ دوسو اوپر کے لئے رکھ لو۔ سوا چار سو میرے پاس ہیں۔"

میاں: "واہ واہ ماشاء اللہ۔ خدا تمہاری عمر دراز کرے۔ اور تمہارے بچوں کو ایسی بیویاں دے۔

پڑھنے والے اب خود فیصلہ کریں کہ یہ باتیں کام کی تھیں یا خبط اور موجودہ طرز تعلیم ناقص ہے یا مکمل۔

خطیب ۱۹۱۷ء

اگلے لوگ

اگلے وقتوں کے بچے کچھے بڈھے ٹھڈے جو صبح شام کی ہوا کھا رہے ہیں۔ ان کا ذکر نہیں۔ بحث تو ان اچھی بھلی صحیح تندرست صورتوں سے ہے جو رفتار زمانہ کے پٹے دونوں ہاتھوں سے ڈھکیل رہے ہیں۔ تھوڑا بہت کر لیا اور بہت کچھ کرنا ہے۔

منصف مزاج دوستو! آخر وہ موقع آگیا۔ جس کا مدت سے ارمان تھا۔ اور وہ وقت آپہنچا جس کے واسطے برسوں سے آنکھیں ترس رہی تھیں!

آج وہ دن ہے کہ پکی محلسرائے ہو یا ٹوٹا سا گھر۔ بڑا بھاری شہر ہو یا چھوٹا سا گاؤں۔ درو دیوار سے بھی ترقی کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔ گوشے گوشے اور چپے چپے۔ غرض کونے کھدرے تک تغیر و تبدل کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ملکہ مغرب کی سواری اپنے وطن سے روانہ ہو کر دریائی مسافت طے کر رہی ہے۔ اور کوئی دم جاتا ہے کہ مشرقی حدود میں داخلہ ہو! ذرا اس دلہن کا اقبال تو دیکھو مرد تو مرد عورتیں تک سارے جھگڑے بھول بھال اور گھر کے دھندے چھوڑ چھاڑ مہمان کے استقبال کی تیاریاں کر رہی ہیں۔ مزا یہ ہے کہ یہ سب ایک رنگ میں رنگے ہوئے۔ ادھر امیر اپنے کمرہ نشست کو مختلف تصاویر سے مزین کر رہا تو ادھر فقیر اپنے کچے دھابے پر لال قندیل لپیٹ رہا ہے۔ کہ کسی طرح حق مہمان نوازی ادا کر لوں! کچھ عجیب طلسم کا سماں ہے۔ جدھر نظر جاتی ہے۔ ہر شخص اپنی کینچلی بدلے فلاح و بہبودی کے گلدستے ہاتھ میں لئے موجودہ طرز معاشرت پہ

لعن طعن کرتا ترقی کی صدائیں لگا رہا ہے۔

کھڑے کھڑے پاؤں شل ہو گئے۔ دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئیں۔ سوچتے سوچتے دماغ چکرا گیا۔ مگر ابھی اس سمت کا نظارہ نصیب نہیں ہوا۔ جس سے انتظار میں بیسوں راتیں سحر اور مہینوں دن بسر کئے ہیں۔

میدان ترقی کے بہادرو! تمہارا اشتیاق سر آنکھوں پر۔ تمہاری سرگرمی چشم ما روشن دل ما شاد۔ مگر عقل سلیم اتفاق کلی میں متامل ہے۔ جس طرز معاشرت کو جہالت سے تعبیر کر رہے ہو۔ ذرا اس پر غور کی نظر تو ڈالو۔ شہر آبادی۔ یعنی دلی بسنے کے یہی چراغ سحری جواب ایک آدھ جھونکے کے مہمان ہیں۔ اپنی روشنی سے محلہ بھر کو منور کر رہے ہیں! چشم تامل سے دیکھنا کیسی کیسی جھلکیاں نظر آ رہی ہیں۔

کچا پکا گارے مٹی کا گھر ہے۔ مگر لپا لپایا چندن سا! شرم و حیا کی گھڑیاں حسن و جمال کی ڈبیاں۔ جھاڑو بہارو سے فراغت پا۔ پکا ریندھ کھانے سے پہلے کھلانے بیٹھیں۔ باسی کوسی میٹھی کُھٹی جو میسر ہے پڑوس کے اندھے دھندوں کو بھیجا کنبہ کے غریب محتاجوں کو دیا۔ بچا کھچا۔ اچھا برا آپ کھایا۔ ذرا انصاف کی نظر سے دیکھنا۔ ان کے زیور عفت و عصمت میں ہمدردی کا جھومر کس آب و تاب سے چمک رہا ہے!

ان کو خاوندوں کے ساتھ برابری کا دعویٰ نہیں۔ اپنی راحت۔ اپنا عیش اپنا سکھ اپنا چین۔ ان کی خوشی پر قربان کر چکیں! طوق غلامی سمجھو یا اطاعت و فرمانبرداری کا چندن ہار۔ ان کے گلے میں کچھ ہے تو سہی۔ ڈیوڑھیوں پر گھڑیوں گھنٹوں کھڑے رہو۔ ان کی ڈیوڑھیوں پر گھڑیوں کان لگا کر سنو۔ ہوا ان کی آوازیں کچی دیواروں سے باہر نہ لائے گی۔

خدا معلوم ان جاہلوں کی طبیعت میں قدرت نے ہی کوئی مادہ ودیعت کیا ہے

یا صحبت کا اثر اور تربیت کا فیض ہے۔ بہنیں بھائیوں پر پروانہ۔ بھائی بہنوں پر جان نثار! لڑکیاں اطاعت گذار۔ لڑکے فرمانبردار! بڑوں کا ادب۔ چھوٹوں کا لحاظ تعظیم۔ شرم۔ حیا۔ تمیز۔ ان کی گھٹی میں ہے۔

یہ سفید داڑھیاں۔ یہ مبارک صورتیں۔ جو عنقریب صفحہ ہستی سے ناپید ہو جائیں گی آج تمہارے راج میں بیوقوف سہی۔ جاہل سہی۔ لکیر کے فقیر سہی۔ مگر ان کی عمر کے پچھلے ورق تو لوٹ کر دیکھو! زمانہ کا رخ بدل جائے۔ ہوا کے جھکڑ چل جائیں۔ ان کے کارنامے مٹنے والے نہیں! ان پتھروں سے مروت اور محبت کے ایسے چشمے پھوٹے کہ راستہ چلتے مسافر مگن ہو گئے۔

ذرا ان بڑے میاں کو دیکھئے۔ منڈا ہوا سر۔ بھیڈی جوتی۔ کھدی ململ کا ڈھیلا ڈھالا کرتہ۔ ہاتھوں میں دونے۔ بغلوں میں پوٹلیاں۔ سر پر گڑ بھیندے لڑھکتے پڑھکتے چلے آ رہے ہیں۔ . . . مسجد میں ظہر کی نماز پڑھی۔ پڑوس کی پردہ نشین رانڈیں جن کے ہاں گھس لگانے کو مرد کا نام نہیں کبھی کی بیٹھی راہ تک رہی تھیں۔ ان کے گھروں پر گئے۔ پیسے لئے سودے پوچھے اپنا کاروبار رکھ۔ محنت مزدوری چھوڑ بازار گئے۔ انہی دکھیاروں کا بوجھ ہے۔

زمانہ کے نبض شناسو! عالم ہو۔ فاضل ہو۔ لائق ہو۔ فائق ہو۔ کچھ ہی بن جاؤ اور کچھ ہی ہو جاؤ۔ مگر یہ اوصاف بتا رہی ہے کہ اب یہ انداز رخصت ہوئے البتہ آنے والی نسلیں سن لیں گی کہ ہم ان بزرگوں کی اولاد ہیں۔ جن کے قدموں میں خلق و تہذیب کے دریا لوٹتے تھے۔ زمانہ ان واقعات کو فسانہ بنا دے گا مگر یہ کہانیاں بہت روز تک باقی رہیں گی۔

ذرا زمانہ جاہلیت کے بہن بھائی دیکھنا۔ محبت کی سرسبز و شاداب ٹہنی پر کیسے خوش رنگ پھول کھلے ہوئے ہیں ہے تو زچہ گیری۔ جوش محبت کی پوری تصویر ہے

بھائی کے ہاں بچہ پیدا ہوا۔ یہ دیس بہن یہ سن کر بھولی نہیں سماتی بھتیجے کیلئے ہنسلی کڑے بھاوج کے لئے جوڑا لے کر بھائی سے نیگ لینے آئی۔ کس محبت سے کہتی ہے۔

بیرن بھیا میں تیری ماں کی جائی ہولر سن کر بدھاوا لے کر آئی

چھاتی دھلائی کٹوری لوں گی تو لٹ دھلائی روپیہ

پاؤں دھلائی پیری لوں گی تو سٹو کے جیٹھن کو گھوڑا

بھائی کی خوشی میں شریک ہو کر نیگ لینے کے حقوق کیسے مزے سے جتا رہی ہے۔ بھائی سے اتنا خطاب کر چکی تو بھاوج سے دو دو باتیں ہیں ؎

یہ نہ سمجھو بھاوج موری نند ہیٹی نہیں آئی

تیرے للہ کو ہنسلی اور کڑے تجھ کو جوڑا لائی

بھائی پر تو وہ زور تھا۔ مگر اس خیال سے کہ بھاوج کو بار خاطر نہ ہو یوں کہتی ہے۔ حقیر نہ سمجھو کہ تیرے دروازے پر لینے آئی۔ بڑوں کی مثل "بھائی ہس لیجئے بھتیجا بس دیجئے" جو اپنا حق ہے وہ مانگ رہی ہوں جو مجھ پہ ہے وہ یہ موجود ہے۔

یہ تمام قصہ طے ہو جانے کے بعد یہ آخری بات جو بہن کے منہ سے نکلتی ہے وہ ایک پیٹ میں پاؤں پھلانے کا سچا اثر رکھتی ایک گود میں دودھ پینے کا پورا جوش اور خالص محبت کا پکا ثبوت ہے۔ جس دل سے یہ الفاظ نکلتے ہیں اس کی حالت قابل غور ہے۔ کیسی سچی اور اچھی دعا ہے ؎

باگوں میں جیسے آم پھلے رے ایسے پھلے مورا بھائی

الہ العالمین جس طرح باغوں میں بور آکر آم پھلتا ہے۔ اسی طرح میرا بھائی پھلے پھولے۔ بیٹے ہوں پوتے ہوں اس کے کھیڑے بسیں۔ اور میرے باپ دادا کا نام

روشن ہو۔

ملکہ مغرب کے مشتاقو! یہ جلسہ ختم ہوا اور صحبتیں رخصت ہوئیں۔ جن چراغوں کی روشنی در و دیوار تک پھیلی تھی کبھی کے بجھ گئے۔ صحبت شب کی شریک ایک آدھ شمع ادھر ادھر ٹمٹما رہی ہے۔ جو نسیم کے ایک دو جھونکوں کی محتاج ہے۔ جن مقدس صورتوں کی برکت تھی وہ سب خاک میں مل گئیں۔

عزیزو! دوستو! ایک وقت آئے گا اور ضرور آئے گا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اور سر پہ ہاتھ رکھ کر روؤ گے اور ریزہ جواہر زیرِ زمین ہوں گے ڈھونڈو گے مگر بے سود۔ پرکھو گے مگر بے وقت۔

بہارِ مشرق کے باغبانو! گو آج سنسان جنگل میں پڑے آرام کر رہے ہو مگر چمنستانِ حیات میں ایسے پھول کھلا گئے کہ قیامت تک نہ مرجھائیں گے۔ بھانت بھانت کے پکھیرو اور رنگ برنگ کی بلبلیں بیٹھ کر چہکیں گے اور ان کی چہکار مشرق سے مغرب تک پھیلے گی۔ خزاں دنیا بھر کو تاراج و مسمار کرے گی۔ مگر تمہارے مبارک ہاتھوں کی گلکاری صفحۂ ہستی سے مٹنے والی نہیں۔

سنہ ۱۹۰۹ء

عورتوں کی ورزش

منجملہ ان اثرات کے جو مشرق مغرب سے نہ لے چکا بلکہ لے رہا اور لینا چاہتا ہے۔ ایک ورزش نسواں بھی ہے۔ ابھی تین چار ہی ہفتے ہوئے ہیں تنے کسی زنانے پرچے میں ایک مضمون اس کے متعلق دیکھا تھا یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ جو شخص چاہے وہ مرد ہو یا عورت صرف کھانے پہننے اور سونے سے واسطہ رکھے گا اس کی صحت برباد ہوگی۔ دنیا بھر کے امراض اس پر حملہ کریں گے اور پچاس سال کی زندگی پچیس تیس ہی برس میں ختم ہو جائے گی۔ اس لیئے ورزش یعنی اعضاء سے محنت لینی صحت کے واسطے نہایت مفید ہے اور بعض امراض میں تو سو علاجوں کا علاج ورزش یا ہوا خوری وغیرہ ثابت ہوئی ہے ہندستان کے اس حصہ کو چھوڑکر جہاں آدمی کا اطلاق مرد پر ہوتا ہے اور یہ لفظ شوہر کے معنی رکھتا ہے۔ آدمی انسان اور شخص میں مرد اور عورت دونوں شریک ہیں۔ اور اس لئے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک ہی قسم کی ورزش مرد اور عورت دونوں کے واسطے مفید ہو سکتی ہے یا ان کی تقسیم اعضاء کی لیاقت تمدن۔ معاشرت اور مذہب کے لحاظ سے ہونی چاہیئے۔ ورزش کے جو طریقے عام طور پر رائج ہیں۔ مثلاً ڈنڈ۔ مگدر۔ ڈمبل وغیرہ۔ ان میں کپڑے اتار لینا بہتر ہوتا ہے۔ مگر عورتیں مجبور ہیں۔ لیکن ان عورتوں کا ذکر اس وقت نہیں ہے جو مردوں کے مجمع میں بے باکانہ رقص کر سکتی ہوں۔ اس لئے ان کے واسطے کوئی

ایسی محنت ہو کہ ورزش بھی ہو جائے اور ان کی شرم و حیا میں بھی فرق نہ آئے۔

ہندوستان کی عورتیں نہ صرف ہندوؤں کے عہد میں۔ بلکہ شاہان مغلیہ کے دور میں بھی مرد میدان ثابت ہوئی ہیں۔ اور صرف سپہ گری ہی ایسی کافی ورزش تھی کہ اس کے سامنے ہر ورزش ہیچ تھی۔

جب وقت نے مشرقی دلہن کے جسم سے عروج کا لباس عروسی اتار کر سہاگ کا خاتمہ کیا۔ اور رنڈسالہ پہنا کر بیوہ بنایا تو موجودہ پردہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس پردہ میں رہ کر اور یہ معاشرت رکھ کر عورتوں کا ورزش کرنا مشکل تھا۔ حکومت اجڑ چکی۔ امارت کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ بے فکری آزادی سیر سپاٹے سب فنا ہو چکے تھے۔ اب ورزش کی کیا صورت ہو سکتی تھی۔ اس موقع پر مشرق لاریب مستحق تحسین ہے کہ لڑکیوں اور عورتوں کے سپرد جو کام کئے گئے وہی اچھی خاصی ورزش تھی۔ کواری اور ہوشیار بچیوں کا کام یہ تھا کہ وہ گرمی کے موسم میں پانی کے گھڑے بھر کر کوٹھے یعنی بالاخانہ پر لے جائیں۔ اور چھڑکاؤ کریں۔ اگر بالاخانہ نہیں ہے تو انگنائی میں۔ غرض پانی بھرنا چھاننا تازہ باسی الگ کرنا۔ باورچی خانہ میں۔ غسل خانہ میں پہنچانا ان کا کام تھا سردی ہے تو پانی کی گھڑیاں گرم کریں۔ بیاہی ہوئی لڑکیوں یا پوری عورتوں کے واسطے ان کی عمر اور حیثیت کے موافق کام تھے۔ مثلاً آٹا گوندھنا۔ روٹی پکانا۔ چارپائیوں کی ادوائنیں کھینچنی۔ گھر بھر میں جھاڑو دینی۔ بڑی بوڑھیوں کا کام ان کی عمر کے موافق تھا۔ چھالیا کترنی ترکاری بنانی سالن بگھارنا۔ مختصر یہ کہ کام ایسے تھے کہ پوری ورزش ہو جاتی تھی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ کبھی مہینوں بھی دکھ بیماری کا نام سننے میں نہ آتا تھا اگر اوسط نکالی جائے تو آج کل شاید آمدنی کا چوتھائی نہیں تو دسواں حصہ تو بیماریوں پر صرف

ہوتا ہوگا۔

اس وقت اول تو بیماریاں ہی کم تھیں اور اگر تھیں تو ان کا علاج کوڑیوں کا تھا نسخہ کی قیمت بہت ہوئی تو دو پیسے۔ ورزشِ نسواں کے ضروری ہونے سے انکار نہیں۔ مگر مشرق میں یہ اس طرح تھی کہ پتہ ہی نہ چلتا تھا اور پوری ہو جاتی تھی۔

سنہ ۱۹۲۲ء

رسوم

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ جس قدر کسی قوم میں جہالت ہوگی۔ اسی قدر بدعقیدگی توہمات۔ رسوم۔ اور لامذہبی میں گرفتار ہوگی۔ مذہب ہی ایک ایسی طاقت ہے جو انسان کو اس وقت جب کوئی طاقت کام نہیں کر سکتی برے کام کرنے سے روکتی ہے۔ ورنہ بیٹھے بٹھائے کسی کو ضرورت تھی کہ خواہ مخواہ مذہب کے چکر میں پڑتا اپنی خواہشوں کے خلاف بعض عیش اپنے اوپر حرام کر لیتا۔ شام کے وقت ایک شخص کو اطلاع ملتی ہے کہ فلاں گھر میں سناٹا ہے اور روپیہ کے صندوق موجود ہیں۔ زیور کی صندوقچی رکھی ہے۔ اور صرف ایک بڑھیا حفاظت کر رہی ہے یہ مصمم قصد کر لیتا ہے کہ آدھی رات کے وقت بڑھیا کو قتل کر دونگا اور تمام مال لے آؤنگا وہ اس کے لئے تیار ہوتا ہے گھر میں کومل لگاتا ہے اور اندر پہنچکر دیکھتا ہے صندوق اور صندوقچے رکھے ہیں۔ بڑھیا کے پیٹ میں چھری بھونکنے کا قصد کرتا ہے یہ آدھی رات کا وقت ہے۔ اس کے پاس کوئی مشیر یا صلاح کار نہیں ہے مگر یہاں ایک طاقت ہے جو اسکا ہاتھ روکتی ہے اور کہتی ہے کہ اپنی موت کے بعد ایک "ڈے آف ججمنٹ" یعنی یوم الحق بھی ہے بڑھیا غریب ہے کمزور ہے اس کا قتل درست نہیں۔

اس طاقت کا نام ایمان۔ ضمیر کانشنس یا مذہب ہے! رسوم بھی اسی خراب فعل کی ایک شاخ ہے یعنی "رسوم میں کسی نہ کسی طرح خدا کے اختیارات کو معطل کرنے کی کوشش کی گئی ہے یا بھولوں" یعنی بھجوں میں اس لئے ایک معقول رقم صرف کر دی گئی

ہے کہ خدا مجبور ہے کہ مردے کی مغفرت کردے۔ یہی کیفیت شادی کی رسوم کی ہے کہ اگر خدا کے اختیارات سلب نہیں کیئے تو کم از کم اس سے تعلقات منقطع کرلیئے گئے ہیں۔ طرفہ یہ ہے کہ ادائیگی رسوم نام ہے لامذہبی اور خدا سے دوری کا شبرات کے حلوے پٹاخے عقیقہ کی دھوم دھام، یہ تمام باتیں انسان کی لامذہبی کا ثبوت ہیں کیونکہ مسلمان کو تو اللہ یہ حکم دیتا ہے کہ فضول خرچیوں سے بچو۔ کیونکہ مسرفوں کو اللہ دوست نہیں رکھتا پھر اگر کوئی مسلمان شادی غمی یا اور کسی رسم میں روپیہ ضائع کرے تو وہ اللہ کا دشمن ہوا۔

مضمون کا یہ حصہ اس طرح ختم کرنے کے بعد اب ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ کیا ہندوستان کے مسلمانوں کی تمام رسوم کا یہی حال ہے بعض رسمیں یقیناً تباہ کن ہیں۔ لیکن بعض رسموں کے ادا کرنے میں نہ روپیہ ضائع ہوتا ہے نہ مذہب کے خلاف ہوتی ہیں اور وہ ہماری معاشرت یا تمدن میں شامل ہو گئی ہیں۔ یوں صرف کرنے کو تو ایک شخص ایک وقت کے کھانے پر سو روپیہ صرف کردے۔ لیکن ایک آدمی کا پیٹ چند پیسوں میں بھی بھر سکتا ہے۔ اس لئے ہمیں صرف وہ رسمیں لینی چاہئیں جو نہ مذہب پر اثر کر سکتی ہیں نہ روپیہ کی محتاج ہیں اور مشرق ان پر فخر بھی کر سکتا ہے۔

ہندوؤں کے ہاں سال میں ایک روز ایسا ہوتا ہے کہ ہر بیوی اپنے شوہر کی سلامتی کا روزہ رکھتی ہے۔ ذرا اس رسم کے فلسفے پر غور کیجئے علاوہ اس عظمت کے جو شوہر کی طرف سے عورت کے دل میں پیدا ہو کیسا ہی سخت دل آدمی کیوں نہ ہو اس درجہ محبت کرنے والی عورت کی قدر کریگا یقیناً اس کا دل مائل ہوگا اور محبت جو اس تعلق کا اصلی راز ہے بہت کچھ ترقی کر جائیگی اسی طرح ایک اور روز مقرر ہے۔ جس میں کوئی بہن اپنے شوہر کی کمائی کا کھانا نہیں کھا سکتی وہ دن بھر روزہ رکھتی ہے اور اس کا یہ روزہ بھائی کی سلامتی کا ہے اور شام کے وقت بھائی اپنی کمائی سے بہن کا روزہ کھلواتا ہے

عصمت ۱۹۲۲ء

مائیوں کی رسم

دنیا کی آنکھوں نے انقلاب کی جو عجیب و غریب تصویریں دیکھیں ان میں اس صدی کی معاشرت اسلامی میں دو متضاد عنصر دکھائی دیتے ہیں۔ کل کی کیفیت، یہ تھی کہ بیوی شوہر کا نام لینا معیوب سمجھتی تھی۔ لڑکی شادی ہونے کے بعد دنوں باپ بھائی کے سامنے تکلف سے آتی تھی۔ لڑکا بزرگوں کے سامنے اپنے بچے کو گود میں لیتا شرماتا تھا۔ لڑکی مردوں کے سامنے خواہ وہ کیسے ہی عزیز ہوں ننگے سر بیٹھنا مکروہ سمجھتی تھی۔ آج کی یہ حالت ہے کہ بیگم اور مسز کا استعمال فخریہ اور اہلیہ گناہ۔ شادی کے بعد باپ بھائی سے بلا ضرورت گفتگو کرنا عیب تھا۔ آج ہنر ہے۔ خیر عیب تھا یا ہنر۔ اس وقت اس سے بحث نہیں۔ ہمارے سامنے صرف مائیوں کی رسم ہے اور اسی حسن و قبح پر بحث مقصود ہے۔

یہ خیال کہ مسلمانوں نے تمام رسمیں ہندوؤں سے لیں کم از کم مائیوں کی رسم کے واسطے درست نہیں۔ کیونکہ اس میں سوئمبر کی رسم موجود تھی۔ جس میں عورت کو شوہر کے انتخاب کا وہی حق حاصل تھا۔ جو اسلام نے عطا فرمایا ہے۔ مائیوں کی رسم مسلمانوں کی اپنی رسم ہے۔ اگر اس کا تعلق قرون اولیٰ کی مسلمان خواتین سے ثابت نہ بھی ہو سکے تو بھی اس میں اگر خوبی اور نقص نہ ہو تو ضرور مستحسن اور اس کا موجد مستحق شکریہ ہے۔ مائیوں کی رسم کے معنی یہ ہیں کہ وداع سے چند روز پہلے لڑکی

ایک علحدہ کمرے میں بٹھادی جائے وہاں عام طور پر آمدورفت نہو۔ غذا نسبتاً بہتر ملے۔ اور ابٹنے وغیرہ کا استعمال کیا جائے۔

اب اس رسم کی غائت بالکل صاف ہے۔ حجاب۔ شرم وحیا معاشرت اسلامی میں جوہر نسوانیت تھی۔ اور اس لئے جوں جوں روز وداع قریب آتا جاتا تھا لڑکی پہ یہ شرم زیادہ سوار ہوتی جاتی تھی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ گھر میں اس وقت زیادہ تر شادی ہی کی باتیں ہوں گی۔ اور اس سلسلہ میں مردوں کی آمدورفت اور انکا قیام اس زمانہ میں زیادہ ہوگا۔ ایسی حالت میں اس لڑکی کا جو چار دن بعد دلہن بن رہی ہے مردوں کے سامنے موجود ہونا پڑپڑ باتیں ملکانا اس وقت کے شیوہ نسوانیت کے خلاف تھا۔ یہ خیال کہ کمرہ بالکل تیرہ وتار ہو بالکل غلط ہے۔ یہ خیال کہ لڑکی کے پاس کوئی جانہ سکے اس سے زیادہ غلط ہے۔ لونڈیاں۔ مامائیں۔ برابر کی ہم عمر لڑکیاں بہنیں۔ بھاوجیں برابر آتی جاتی رہتی تھیں۔ البتہ مرد اور بوڑھیاں بہت احتیاط کرتی تھیں۔

ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ دلہن کو مائیوں میں غور و خوض کا کافی موقعہ ملتا تھا اور وہ طے کرلیتی تھی کہ اس کو آئندہ کیا کرنا اور کس طرح زندگی بسر کرنی ہے۔

عروس مشرق

سچی بات یہ ہے کہ نہ مشرق فرشتہ ہے نہ مغرب۔ کمزوریاں سمندر کے اس پار والوں میں بھی ہیں اور اس پار والوں میں بھی۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ ہر ملک کے رنگ ڈھنگ اپنے اپنے حالات کے اعتبار سے ہوتے ہیں۔ جس طرح ہم کو مغرب کی بعض چیزیں اچھی نہیں معلوم ہوتیں۔ اس طرح مغرب والے ہماری اکثر باتوں پر ہنستے ہیں۔ عادتیں تو الگ ہیں۔ مذاق یعنی پسند میں بھی فرق ہے ہمارے یہاں سفید بال بڑھاپے کی نشانی ہیں۔ لیکن بعض جگہ وہ پسند کئے جاتے یہی کیفیت دانت اور دوسرے اعضا کی ہے۔ مختصر یہ کہ اسی طرح عادتوں کا حال ہے ہمارے ہاں خاموشی شرم وحیا سمجھی جاتی ہے۔ دوسرے ملکوں میں عیب۔ ہمارے ہاں اگر کوئی دلہن سسرال پہنچکر دنیا بھر کی باتیں شروع کر دے تو وہ بےحیا سمجھی جائے گی۔ مگر بعض جگہ اس کی خاموشی معیوب خیال کی جاتی۔ ہم اگر ان کی ریس کریں یا وہ ہماری تو وہی مثل ہوگی کہ کوا چلا ہنس کی چال وہ اپنی بھی بھول گیا۔ ہمارے ہاں کی دلہن اگر ایسی خاموش ہو جائے گی کہ کسی سے بات ہی نہ کرے تو یہ شرم وحیا نہیں۔ لغویت ہوگی۔ اس لئے کوئی چیز حیا سے زیادہ نہ ہونی چاہیئے۔

مسلمان لڑکیوں کو دیکھنا چاہیئے کہ ان کے ہاں جو خوبیاں ہیں یا سمجھی جاتی ہیں

دوسروں کے دیکھا دیکھی۔ ان کو ہاتھ سے نہ دیں۔ ایک دو نہیں بہت سی باتیں ہیں جن پر
ہم ہمیشہ فخر کرتے تھے۔ اور اب وہ ہمارے پاس سے رخصت ہو رہی ہیں۔ یہ کچھ
کم افسوس کی بات نہیں ہے۔ مثال کے طور پر سمجھنا چاہیئے کہ عورت کا دل مرد سے
زیادہ نرم ہوتا ہے۔ وہ کسی کی تکلیف یا مصیبت سے مرد کی نسبت جلد متاثر ہو جاتی
ہیں۔ آج سے بیس پچیس برس پہلے مسلمان عورتیں اپنے ہمسائے دور پرے کے
رشتہ دار یا گھر کی نوکر ماماؤں سے جو سلوک کر رہی تھیں اس وقت وہ چیز ہمارے
ہاں اتنی نہیں رہی۔ آج وہ ہمدردی اور رحم کا مادہ مسلمان لڑکیوں میں گھٹ رہا ہے
یہ بات اس طرح اور آسانی سے سمجھ میں آ جائے گی کہ محلہ کی مسجد میں جو ملاجی رہتے
تھے وہ زیادہ تر طالب علم ہوتے تھے۔ یا بڈھے مسجد کے خدمت گذار اگر وہ طالب علم
ہوتے تھے۔ تو حضور اکرم کے ارشاد کے موافق ان کی خدمت ایک اچھا کام تھا
اگر بڈھے ہیں اور مسجد کی خدمت کرتے تو بھی ان کا حق ہم پر پیدا ہو گیا۔ کہ وہ خانۂ خدا
کی خدمت کر رہے ہیں۔ اب محلہ کا کام یہ ہے کہ ان کو کھانے کی فکر سے چھٹکارا دلوائے
چنانچہ ہر گھر سے ان کی خدمت ہوتی تھی۔ اور گھر والی بیوی پہلے ان کا کھانا بھیج دیتی
تھی اور سمجھتی تھی کہ اس کا ثواب کسی عزیز کو پہنچے گا۔ مگر اب یہ اعتقاد ختم ہو چکے۔
مسلمان لڑکیاں اپنے کسی جوہر کو مٹاتے وقت اچھی طرح غور کر لیں کہ اس کی
تہ میں کیا خوبیاں ہیں۔ جو کھو رہی ہیں۔

بنات سنہ ۱۹۳۴ء

لڑکیوں کی تربیت

چند سال ہوئے تعلیم نسواں کے سلسلے میں دور حاضرہ اور دور گذشتہ کی مسلم خواتین کے متعلق بحث شروع ہوئی تھی۔ مگر جس طرح اور بہت سے مسائل کا حشر کاغذی گرما گرمی تک ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ مسئلہ بھی کچھ دن اپنا زور شور دکھا کر ختم ہو گیا اب پھر کچھ روز سے بالخصوص اس وقت سے جب سے کہ ایک زنانہ پرچہ نے لڑکیوں کے نصاب کا مسئلہ پیش کیا ہے۔ اس پر بحثیں ہو رہی ہیں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ جو مسلمان تعلیم نسواں کی ضرورت کو محسوس کر رہے ہیں۔ ان میں سے بیشتر اسی تعلیم کے موافق ہیں جو اس وقت کے مدارس میں ہو رہی ہے مگر زیادہ نہیں تو چند ایسے بھی ہیں جو میری طرح دور گذشتہ کی بیبیوں کو اسلام کی کسوٹی پر دور حاضرہ کی تعلیم یافتہ خواتین کے مقابلہ میں زیادہ مفید بتائیں گے۔

میں پچھلے پرچہ میں نصاب مروجہ کی ایک جھلک دکھا چکا ہوں اور ان حضرات سے جن کی زبان پر مرنے والی بیبیوں کا نصاب ماقیما کریما تک محدود ہے دریافت کر چکا ہوں کہ یہ نصاب جس کی یہ تین ریچھوں والی کہانی موجود ہے۔ کس حد تک لڑکیوں کے اخلاق پر اچھا اثر ڈالے گا۔ اس کا جواب میں نے ابھی تک نہیں دیکھا۔ البتہ میری نظر سے ایک اور مضمون گذرا جس میں یہ تعجب انگیز فقرہ درج تھا کہ پہلے زمانہ کی لڑکیاں لکھنے سے قطعی محروم تھیں۔ ان کو لکھنا نہیں سکھایا جاتا تھا۔ اس مضمون میں منجملہ اور بہت سی باتوں کے قابل مضمون نگار نے یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ دور گذشتہ کی بیبیوں کی کتابیں چونکہ

یہی دو چار تھیں ۔ اس لئے طب، وغیرہ کا ان کو علم نہیں ہو سکتا تھا اور وہ ان چند باتوں کے سوا جو ان باتوں میں درج تھیں اور کچھ نہ جان سکتی تھیں۔

مجھے تعجب ہے کس طرح مسلمان ان خیالات سے متفق ہو سکتے ہیں تعلیم علیحدہ چیز ہے اور تربیت علیحدہ۔ پہلے زمانہ میں تعلیم کتابوں کی ہوتی تھی اور تربیت گھر کی بڑی بوڑھیاں کرتی تھیں۔ آج وہ چیز نہیں ہے اور تربیت کی مسلمانوں کو ضرورت نہیں رہی۔ صحبت جو میسر آرہی ہے وہ ناقص ہے نتیجہ یہ ہے کہ اسلام جو اصلی چیز تھی فنا ہو رہی ہے اور اس کا ذمہ دار موجودہ نصاب ہے۔

مسلمانوں نے اچھی طرح دیکھ لیا کہ نصاب مروجہ نے لڑکوں ہی کو سچے معنوں میں مسلمان نہ رکھا۔ اور اس کا ثبوت بڑے بڑے شہروں کی وہ عالیشان مسجدیں ہیں جن کے نیچے مغرب کی نماز کے وقت سینکڑوں تعلیم یافتہ مسلمان دنیاوی ضرورتوں میں مصروف نظر آتے ہیں۔

اس تجربہ کے بعد اگر یہی تعلیم لڑکیوں کو بھی دی گئی تو جو تھوڑا بہت اسلام کا چرچا مسلمان گھروں میں صرف عورتوں کے دم سے موجود ہے وہ بھی ختم ہوگا۔ اب تعلیم نسواں کے سلسلہ میں مسلمانوں کا پہلا فرض۔ ان کے نصاب میں مذہب داخل کرنا ہے تاکہ مسلمان بچیاں مدارس کی تعلیم کے بعد بھی مسلمان رہیں اور اگر اسلام کو کھو کر وہ فرشتہ بھی ہو گئیں تو مسلمانوں کے لئے بے سود ہیں۔

فروری ۱۹۳۵ء کے عصمت میں میں نے حافظہ عطیۃ النساء مرحومہ و مغفورہ کے حالات لکھے تھے انہوں نے اسّی برس کے قریب عمر پائی۔ ان کی تعلیم و تربیت غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے اور اس کے کچھ بعد کی تھی۔ میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ ان کے جنازے کے ساتھ ان کے اپنے حافظ شاگردوں کی تعداد اس قدر کثیر تھی کہ

عزیزوں کو کندھا دینے کی نوبت مشکل میسر آئی۔ کیا میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ دور حاضرہ کی کسی تعلیم یافتہ خاتون کا جنازہ بھی اس دھوم دھام سے ہندوستان کے کسی شہر میں اٹھا ہے؟ اگر حفظ قرآن یا تعلیم حفظ قرآن معیار قابلیت قرار نہیں پاسکتا۔ تو میں نے اسی مضمون میں یہ بھی لکھا تھا کہ مرتے وقت تک انکا آٹھویں دن وعظ جس میں دہلی کے بڑے گھرانوں بالخصوص پنجابیوں کی اکثر خواتین شریک ہوتی تھیں۔ ناغہ نہیں ہوا۔ آج کس قدر انجمنیں کس قدر سوسائٹیز ہندوستان میں ایسی موجود ہیں، جن میں بلاناغہ اور بلا معاوضہ کوئی تعلیم یافتہ خاتون اپنے لیکچر یا سپیچ سے اس قسم کا فائدہ پہنچا رہی ہے؟ ان کا خط زیادہ اچھا تو نہ تھا۔ مگر لکھنا جانتی تھیں اور ان کے خط کو دیکھ کر یہ کہنا کہ اگلے زمانہ کی عورتیں لکھنا نہیں جانتی تھیں، درست نہیں رہتا۔

اب میں ایک دوسرا زندہ کیرکٹر شروع کرتا ہوں۔ یہ بیوی اس وقت ارض حجاز میں ہیں۔ شمس العلماء مولوی نذیر احمد کی نواسی اور مولوی اشرف حسین صاحب مرحوم کی بیوی۔ ان کی پرورش اور تربیت کا زمانہ غدر ۱۸۵۷ء کے آٹھ دس سال کے بعد کا ہے۔ انہوں نے تعلیم بھی گھر پر پائی۔ اور ان کی تربیت بھی گھر میں ہوئی ان کی تربیت کا سہرا میری بڑی پھوپی مولوی نذیر احمد صاحب کی بیوی مرحومہ صفیۃ النساء کے سر ہے۔ میں اس وقت بھی دعوے سے کہتا ہوں کہ اگر ہندوستان کی مکمل تعلیم یافتہ سو لڑکیاں منتخب کی جائیں تو ایک مسلمان عورت کی تمام حیثیتوں کا مجموعہ جس قدر ان کی ذات میں ہے دوسری اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت میں مشکل سے ہوگا ان کا خط اگر سو سے بدتر ہوگا تو ہزار سے بہتر۔ وہ انگریزی نہیں جانتیں۔ مگر بچوں کی پرورش اور تربیت کا ملکہ اس قدر کافی ہے کہ شاید زیادہ سے زیادہ کسی طبی مدرسہ کی تعلیم یافتہ لڑکی کا بھی اتنا ہی ہوگا۔ وہ بچوں کی بیماریوں اور ان کی دواؤں کی

خاصیت سے باخبر ہیں۔ انہوں نے اپنے بچے معمولی شکایتوں میں کبھی حکیم کے ہاں نہیں بھیجے ایک موقعہ پر ان کا اپنا بڑا بچہ شاید دو سال کا بیمار ہوا۔ جاڑوں کے دن تھے۔ سانس کی شکایت ہوئی، صبح کے وقت بعض کی رائے ہوئی کہ پسلی ام الصبیان کا اندیشہ ہے۔ حکیم شجاعت علی خاں کو جو اس وقت کے مشہور طبیب تھے بلانا چاہیے۔ مگر انہوں نے اس سے اتفاق نہ کیا۔ خود بازار سے دوائیاں منگوائیں۔ اور کائفل کی دو پوٹلیاں بنا کر ایک سینہ پر ٹکا دی دوسرے دن بچہ کی حالت میں آسمان و زمین کا فرق تھا۔

سوئی کا کام کنبہ کی اکثر عورتیں اتنا ہی اور دو ایک ان سے بہتر جانتی تھیں مگر ایک دفعہ انھوں نے اپنے شوہر کے واسطے تکیہ کا غلاف اور کرتہ کاڑھا۔ مولانا اشرف حسین مرحوم اس وقت لکھنؤ میں انسپکٹر زراعت تھے۔ احباب نے غلاف بہت پسند کیا اور صدر قانون گو صاحب جو لکھنؤ کے رہنے والے تھے کرتہ پر ایسے ریجھے کہ اس کا گریبان اور بوٹی دکھانے کے واسطے اپنے گھر لے گئے۔

کھانا پکانے کے واسطے ان کے پاس دو مامائیں تھیں۔ اور جب شوہر کے ساتھ جاتی تھیں تو ایک باورچی بھی۔ مگر شوہر کا کھانا ہمیشہ وہ اپنے ہاتھ سے پکاتی تھیں اور مختصر یہ ہے کہ کھانا پکنے کے وقت ان کا تمام وقت اسی میں صرف ہوتا تھا اور بہت کم باورچی خانہ سے الگ ہوتی تھیں۔ مولانا مرحوم کانپور کی تحصیل اکبرپور کا معائنہ کر رہے تھے فضل علی صاحب ڈپٹی کلکٹر کا کیمپ بھی وہیں تھا اور ہیں بھی وہیں۔ شام کے چار بجے تھے کہ فضل علی صاحب نے آ کر کہا۔ بیگم صاحب آج راجہ صاحب آگئے ہیں۔ رات کے کھانے کا انتظام آپ کر دیجیے۔ لکھنؤ کے رہنے والے ہیں اور کھانے کے شوقین۔ دلی کا نام ہو جائے۔ رات کے دس بجے فضل علی صاحب مع مہمانوں کے

آگئے۔ کھانا چنا گیا۔ راجہ صاحب نے بہت تعریف کی اور فرمایا "لکھنؤ میں اسقدر جلد اچھا کھانا آسانی سے تیار نہیں ہوتا تھا۔

ان کے مزاج کی سادگی کنبہ میں مشہور ہے۔ محلہ کی اکثر حاجت مند عورتیں ان کے پاس اپنی ضرورتیں لے کر آتیں اور مشکل سے ناکام جاتیں ان کی فراخ حوصلگی کا ایک واقعہ جو آج تک راز تھا اور میرے علم میں ہے بیان کرتا ہوں۔ ایک عزیز کی بیوی بیمار ہوئیں۔ اور علاج میں اس قدر روپیہ صرف ہوگیا کہ ان کو قرض لینے کی ضرورت ہوئی۔ بیچارہ نے پچاس روپیہ ایک عزیز سے جواب تک زندہ ہیں قرض مانگے مگر نہ ملے۔ بیگم صاحب کو بھی خبر ہوئی۔ ان کو دیکھنے گئیں۔ اور چلتے وقت نہایت خاموشی سے پچاس روپیہ کے نوٹ ان کی جیب میں ڈال دیئے۔ میں اس وقت وہاں موجود تھا۔ اور میں نے دیکھ لیا۔ لیکن حاجت مند کو پتہ نہ چلا۔ انہوں نے مجھ سے ذکر بھی کیا۔ مگر میں خاموش رہا۔

شوہر کے ساتھ ان کے تعلقات آجکل کے لوگوں کو کہانیاں معلوم ہوں گے مگر اس کے دیکھنے والے دو چار نہیں۔ کنبہ کا کنبہ موجود ہے۔ ان کو اپنے شوہر کے مولانا اشرف حسین مرحوم سے محبت نہیں عشق تھا۔ دو دو تین تین مامائیں، دو دو تین نوکر لڑکے۔ مگر مولانائے مرحوم کا حقہ اپنے ہاتھ سے بھرتی تھیں۔ جاڑوں میں کوٹھے پر اور گرمی میں دو منزلہ پر خود لے کر جاتی تھیں۔ اور خوش ہوتی تھیں۔ جہیز میں معقول جائداد ملی تھی مگر ہمیشہ ساس نندوں کے ساتھ بسر کی۔

ان کا سب سے بڑا انصاب گھر کی تربیت اور بزرگوں کا فیض صحبت تھا۔ گھر میں ہر وقت قرآن وحدیث کا چرچا تھا۔ آٹھویں دسویں روز وعظ۔ مہینے دوسرے مہینے مولوی نذیر حسین صاحب محدث کی باتیں یہ ہی تھیں وہ چیزیں جنہوں نے ان کو مسلمان عورت بنایا۔ شوہر کے بعد انکا دل دنیا سے بیزار ہوگیا۔ بیٹے بیٹیاں۔ نواسے نواسیاں

پوتے پوتیاں غرض بھرا گھر موجود ہے۔ لیکن آنکھ کا آنسو نہیں تھمتا۔ ایک روز خواب میں دیکھا کہ شوہر کے ساتھ حج کر رہی ہوں اسی سال حج کو تشریف لے گئیں واپس آئیں۔ مگر یہاں دل نہ لگا۔ مشکل سے دو سال کاٹے۔ ہر وقت مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی تسبیح تھی۔ اس سال پھر گئی ہیں اور یہ فرما گئی ہیں کہ انشاء اللہ ڈیڑھ سال وہاں رہ کر دوسرے حج کے بعد واپس ہوں گی۔

میرا مقصد اس تحریر سے یہ نہیں ہے کہ اگلے زمانہ کی تمام عورتیں قابل ستائش تھیں اور آج کی (خدانخواستہ) لائق ملامت۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ نصف صدی پیشتر کی مسلمان عورتوں میں جو اسلامی شان پائی جاتی تھی وہ آج کی اکثر لڑکیوں میں نہیں ہے۔ یہ میں نہیں کہتا کہ مکان اور کوٹھیاں میز و کرسی سے مزین نہ ہوں مگر یہ ضرور کہتا ہوں کہ اس کے ساتھ ہی گول کمرہ میں نہیں، کسی کوٹھری میں جانماز بھی بچھی ہوئی نظر آجائے۔ بیوی اگر ایک طرف گھر کی ملکہ ہو تو دوسری طرف حقیقی معنوں میں شوہر کے دکھ سکھ کی شریک۔ خدا کا شکر ہے مسلمان لڑکیوں کی تعلیم پر متوجہ ہو رہے ہیں۔ اور ہو رہے ہیں۔ اب ان کا فرض ہے کہ نصاب میں مذہب کو مقدم سمجھیں۔ اور تربیت کو تعلیم سے کم ضروری نہ خیال کریں۔

عصمت ستمبر ۱۹۲۶ء

جاہل اور تعلیم یافتہ بیویاں

سنتی ہوں زمانہ ترقی کر رہا ہے۔ عورتیں تہذیب یافتہ ہو رہی ہیں۔ لڑکیاں تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ ظاہر میں تو یہ خبر نہایت اچھی اور غیروں تک کا دل خوش کرنے والی ہے، مگر جاہل عورتوں میں جن کا زمانہ آج سے بیس پچاس برس پہلے تھا کچھ ایسی خوبیاں بھی تھیں جن کو موجودہ تہذیب مٹا رہی ہے یا تو وہ خوبیاں ہی نہ تھیں اور یا زمانہ کی رفتار نے ہم کو ایسا نقصان پہنچایا کہ یہ کھوئی ہوئی دولت اب آسانی سے دوبارہ ہاتھ آنے والی نہیں۔ آج سے پچیس برس پہلے کی ایک گھر والی کو دیکھنا۔ کھنڈر تو نہیں مگر معمولی کچا پکا گھر ہے جہاں میز کرسیوں کا پتہ نہیں اور کمرہ میں بھی کوئی خاص نفاست نظر نہیں آتی، البتہ ایک کونے میں جانماز بچھی ہوئی ہے اور بابر کی الماری میں قرآن شریف رکھا ہوا ہے یہ بیوی ادھیڑ ہیں۔ مگر ان کے ہاتھ پاؤں مضبوط اور ان کی ہمت جوانوں سے زیادہ۔ میاں سو روپیہ کے سررشتہ دار ہیں، اور اوپر کی بھی تھوڑی بہت آمدنی ہے۔ مگر سوا ایک دور پرے کی رشتہ دار بڑی بی کے گھر میں کوئی ماما یا نوکر نہیں ہے۔ کچھ بڑی بی، کام کر دیتی ہیں۔ کچھ لڑکیاں ہاتھ بٹا لیتی ہیں۔ اور اس طرح دس آدمیوں کی دعوت ہو تو اور دو آدمیوں کا کھانا ہو تو تمام مرحلے آسانی سے طے ہو جاتے ہیں۔

یہ بیوی صبح کی نماز سے فارغ ہوتے ہی باورچی خانہ میں جا پہنچتی ہیں اور چائے ہوتی ہے نہ ناشتہ۔ ادھر میاں وظیفہ سے فارغ ہوئے، ادھر انھوں نے دستر خوان بچھایا۔ میاں کچہری گئے تو بچوں کو کھانا دیا۔ محلہ کی ایک ہمسائی کی لڑکی کٹورا ہاتھ میں لئے آنکلی اور کہا۔ ماں نے کہا ہے۔ بھائی کی روٹی رکھی ہے،

ذرا سا سالن دے دو، اس کو دیا۔ جو بچا وہ اب کھانے بیٹھیں پتیلی پونچھی سالن نہ بچا دال کھائی پیٹ بھر لیا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر اس نعمت پر خدا کا لاکھ شکر ادا کیا۔

محلہ میں کوئی بڑھیا ٹھڑیا مر گئی، ان کو خبر ہوئی، گھر کے کام کاج چوپٹ گئے، اس کے یہاں پہونچیں، تعزیت یا پرسے کو نہیں نہلانے اور کفنانے کسی یتیم بچی کی شادی ہوئی، دلہن کی ماں خاموش آکر ان کے پاس بیٹھ گئی۔ اٹھیں اور چپکے سے سے لا کر ایک پوڑیہ اس کے ہاتھ میں دیدی ڈھونڈھ ڈھانڈھ کر کچھ کپڑے نکالے ایک آدھ برتن ڈھونڈھا اور اس کے ساتھ کر دیا۔ شام کے کھانے میں ملاجی کو روٹی بھیجی۔

بال بچوں کی شادی ٹھہری میاں پریشان ہوئے تو بیوی نے سو دو سو نہیں ہزار پانسو آگے نکال کر رکھ دیئے۔ اور یہ نقد ہی نہیں کپڑا لتا بنا بنایا سلا سلایا الگ دیا غرض یہ وہ زندگی تھی کہ جس میں کسی قسم کا نقص نہ تھا۔

اب لاہی موجودہ زندگی تو آج کل کی لڑکیاں آنکھ کے سامنے ہیں جو آئے دن کی مریضن اور ہر وقت کی روگی۔ تین تین چار چار مامائیں آگے چولھے کے پاس جانا قسم۔ کام کاج کو ہاتھ لگانا حرام۔ بہت بڑا کمال کیا تو کوئی اخبار یا رسالہ پڑھ لیا۔ انکی صحت جیسی ہوگی ظاہر ہے اور وقت پر میاں کے آگے روپیہ کی جوڑ دھری بچی بچائی رکھ دیں گی وہ بھی ظاہر ہے۔

سنہ ۱۹۱۶ء

پچاس سال نہیں چودہ سو سال پیچھے

عصمت کی ایک قدیمی معاون جو عرصہ سے اس کے مضامین پر پسندیدگی کا اظہار فرماتی ہیں۔ اپنے ایک تازہ خط میں تحریر کرتی ہیں کہ میں عصمت کو ہمیشہ پسند کرتی رہی اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی تھی کہ وہ ہمارے حقوق کا مطالبہ نہایت ہمت سے کر رہا ہے مگر اب چند روز سے جو روش اس نے اختیار کی وہ پسندیدہ نہیں کیونکہ صرف میں ہی نہیں، بلکہ میری اور بھی دو بہنیں جن میں سے ایک عصمت کی خریدار ہیں اس نتیجہ پر پہنچی ہیں کہ عصمت ہم کو پچاس برس پیچھے ڈھکیلنا چاہتا ہے۔ اور جو ترقی ہمارے فرقہ نسواں نے اس نصف صدی میں بمشکل تمام کی ہے اس سے ہٹا کر ہم کو پھر اسی تنزل پر پہنچانا عصمت کا منشاء معلوم ہوتا ہے۔

اس خط کو پڑھنے کے بعد دو تین سوال پیدا ہوتے ہیں۔ اول تو یہ کہ کیا واقعی عصمت کی روش میں کوئی فرق آگیا اور جو مقصد اس کا پہلے تھا اب وہ نہیں، دوسرے یہ کہ آیا حقوق نسواں کا جو مطالبہ اس کو مدنظر تھا، آیا وہ اب بھی ہے یا نہیں تیسرے یہ کہ مسلمان عورتوں نے اس نصف صدی میں جو کچھ حالت بدلی اس پر صحیح معنوں میں ترقی کا اطلاق جائز ہے یا نہیں۔

پہلی بات یعنی عصمت کی روش میں کوئی فرق آگیا یقیناً درست ہے عصمت کی اپنی رائے ہمیشہ یہ رہی ہے کہ ہندوستان کا موجودہ پردہ حالت موجودہ کا نتیجہ ہے اور مخالف پردہ جو دلائل پردہ کے توڑنے کے پیش کرتے ہیں وہ کافی نہیں۔ مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور دوسرے ممالک اسلامیہ کے حسب پردہ کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ اس سے انکار نہیں مگر وہاں کی حالت اور یہاں کی حالت میں آسمان

زمین کا فرق ہے۔ وہاں سب سے بڑی جیت یہ ہے کہ قانون اپنے ہاتھ میں ہے
مگر یہاں قانون ہمارے ہاتھ میں نہیں۔ اس لئے ہم کو وہاں کی تقلید مناسب نہیں
ہاں پردے میں بعض بعض خاندان بہت زیادہ سختی کر رہے ہیں۔ مثلاً ڈولی پر بھی
چاروں طرف چادر لپیٹ دی جاتی ہے۔ یہ البتہ صحیح نہیں، اسی طرح قدامت کی
حمایت عصمت ہمیشہ کرتا رہا۔ اور اب بھی کرتا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس میں
کوئی عیب ہی نہ تھا، اور جدت میں سب عیوب ہیں۔ ہاں یہ کہنے میں تامل نہیں کہ
قدامت میں پچیس فی صدی عیب تھے، تو جدت میں پچھتر فی صدی۔ اس لئے
دونوں کو سمو کر معتدل رستہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

رہی دوسری بات یعنی حقوق نسواں کا مطالبہ اس کا ثبوت خود پرچہ ہے کہ
جس طرح وہ پہلے ان حقوق پر لڑ جھگڑ رہا تھا جو اسلام نے عورتوں کو عطا کئے
ان ہی حقوق پر وہ اس وقت بھی بحث کر رہا ہے اور جہاں وہ عورتوں کو یہ تعلیم دیتا
ہے کہ تم مردوں کی فرمانبردار بیوی ہو۔ وہاں مردوں سے بھی یہ کہہ رہا ہے۔ کہ عورتیں
تمہارے گھر کا لباس ہیں۔

اب رہا تیسرا سوال یہ البتہ ٹیڑھا مسئلہ ہے اور اس میں خواہ عصمت کو کچھ ہی کہو
اور کچھ ہی بنایا جائے۔ وہ تو یہی کہے گا کہ یہ ترقی ترقی نہیں تنزل ہے اور جب تک مسلمان
عورتیں مذہب کے دائرہ میں بیٹھ کر کام نہ کریں گی، وہ چاہیں گی آسمان میں تھگلی لگائیں
مگر ترقی سے بہت دور ہوں گی۔ اگر اس حالت میں عصمت کا یہ وعظ کہ لڑکیاں مذہب
سے باہر نہ نکلنے پائیں گر یہ معنی رکھتا ہے کہ عصمت فرقہ نسواں کو پچاس سال پیچھے ڈھکیل
رہا ہے تو ہم علی الاعلان کہتے ہیں کہ پچاس سال نہیں چودہ صدی پیچھے۔

سنہ ۱۹۱۸ء